آس پاس

احمد ندیم قاسمی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

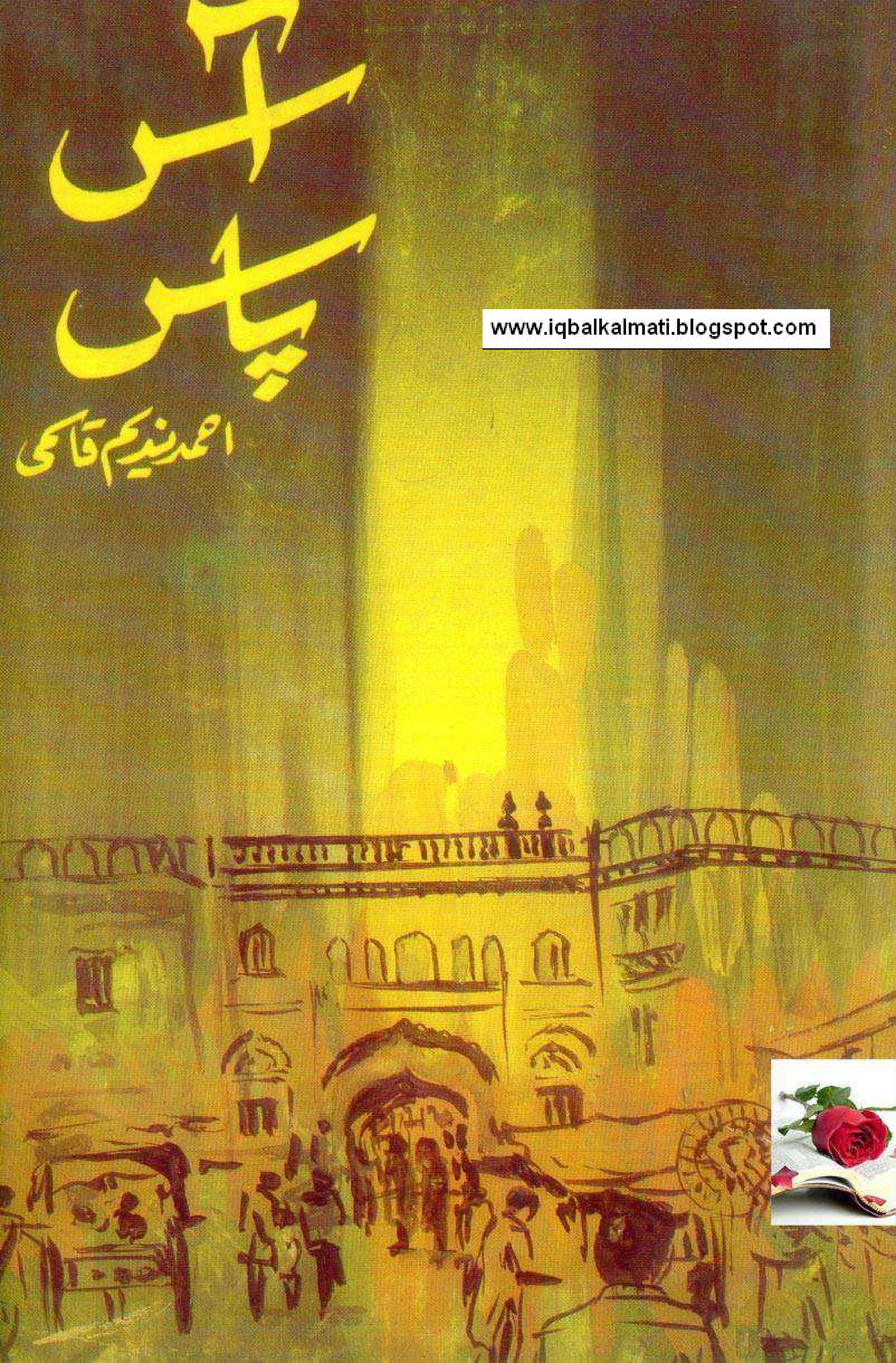

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ترتیب

۱۔ اکیلی	۹
۲۔ بھری دنیا میں	۲۸
۳۔ اُفق	۴۴
۴۔ کرن	۵۷
۵۔ موت	۷۲
۶۔ تکمیل	۸۶
۷۔ ارتقا	۱۰۰
۸۔ چڑیل	۱۱۵

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اکیلی

انگڑائی کا تناؤ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ انگڑائی ٹوٹ گئی۔ باہیں اُدھ کٹی شاخوں کی طرح لٹک گئیں اور گالوں کی شفق زردی میں بدل گئی۔ خانی ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی "جمو میرے بھائی! تھوڑا سا پانی تو لا دے۔"

جمو باہر صحن میں تازہ دھوپ کی پھوار میں بیٹھا جوار کے ٹانڈے چوس رہا تھا' پکارا "گنا لا دوں؟" "ارے کمبخت' پھر گنا؟" خانی کھاٹ سے کودی' بھاگی بھاگی صحن میں آئی اور جمو کے ہاتھ سے جوار کا ٹانڈا چھین کر پرے پھینک دیا "لالچی۔ منہ اندھیرے چل نکلتا ہے دوسرے لوگوں کا مال ہتھیانے۔ اور پھر کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ جمو بھیا! جوار کے رس سے کھانسی ہو جایا کرتی ہے' بخار آ جاتا ہے' مرجاتا ہے آدمی' پر تُو ہے کہ زبان کا چٹخارہ چین نہیں لینے دیتا تجھے۔ صبح سویرے لوگ اللہ رسول کا نام لیتے ہیں اور ایک تُو ہے کہ ——"

"تُو نے کون سے نفل پڑھے ہیں؟" جمو نے دیوار کے پاس پڑے ہوئے ٹانڈے کی طرف دیکھ کر شرارت سے کہا "اپنی حالت نہیں دیکھتی؟ دن ڈھلے ہاتھ منہ دھوئے جاتے ہیں اور چلی ہے مجھے نصیحتیں کرنے۔"

خانی اپنے سے چھ سات برس چھوٹے بھائی کی یہ شرارت بھلا کیسے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

برداشت کرلیتی' ایک طمانچہ تان کر جمو کے گال پر جمایا' اور پھر ٹانڈا اٹھا کر اس کے ہاتھوں میں ٹھونستے ہوئے کہا' "لے چوس مر۔ جی جلانے کے لیے زندہ ہے۔ تو کیوں نہ مرگیا دوسروں کے ساتھ۔"

اور پھر وہ جمو کو روتا دیکھ کر خود بھی رونے لگی۔ اسے سینے سے لگا کر بولی "کیسے مزے سے قبرستان میں پڑے آرام کر رہے ہیں۔ یہ نہیں سوچا کہ بیٹا بیٹی اکیلے کیا کریں گے۔ وہاں دن بھر دھوپ سینکتے ہیں رات بھر اندھیرے کی چادر اوڑھے" ——— خانی شاعری پر اتر آئی۔

پچھلے چند مہینوں سے اس کا معمول ہو گیا تھا کہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے اچانک وہ کوئی ایسی بات کہہ جاتی کہ سننے والیاں منہ کھولے اسے گھورنے لگتیں اور پھر کہتیں "ارے خانی کیسی باتیں کرتی ہو تم؟ میں سمجھی کسی دوہے کا بول دہرا رہی ہو" ——— اور خانی لجا کر کہتی "کیا کروں۔ تمھی بتاؤ' جب گہرے کالے بادل سے سورج نکلتا ہے' اور تمھیں معلوم ہوتا ہے کہ دوسرا کالا بادل اسے نگل جانے کے لیے بڑھا آ رہا ہے' تو اس تھوڑی دھوپ کے سنہری خزانے سے تم اپنی جھولیاں نہیں بھرلیتیں؟ انگڑائیاں نہیں آتیں تمھیں؟ کیا تم یہ نہیں چاہتیں کہ تم ناچنے لگو اور ناچتے ناچتے اوپر اڑنے لگو۔ اور اڑتے اڑتے ان بادلوں کو چیر کر آگے نکل جاؤ اور تاروں اور نیلاہٹوں اور چاند سورج اور ——— ہائے ری' میں بھی کیسی پاگل ہوں!" ——— وہ سر دونوں ہاتھوں میں دبا کر سہم سی جاتی اور پھر خود کہتی "پاگل ہی تو ہوں۔"

جمو کے پاس آ کر کہتی "جمو بھیا کیا میں پاگل ہوں؟"

اور وہ اس سے لپٹ جاتا "میری بہن! میری خانی! میری گڑیا!"

"اتنی بڑی گڑیا؟" خانی خوش ہو کر کہتی "اتنی لمبی اور اتنی پتلی' اور پھر ایسے میلے میلے کپڑوں والی۔ نہ ریشم کا دوپٹہ' نہ سونے کا جھومر' نہ طلائی جوتا۔ بس ایک ہنسلی ہی ہنسلی۔ بڑی گندی گڑیا ہے تمھاری۔"

جمو اپنی غلطی محسوس کر کے یوں مضمحل سا ہو جاتا ہے جیسے رلا دینے کے لیے بس اسے چھو دینا ہی کافی ہے۔ اس کے گال پھول جاتے' نچلا ہونٹ لٹک کر ٹھوڑی کی گولائی کو مس کرنے لگتا۔ آنکھوں کے کنارے پر سیال چاندی پھر جاتی' اور خانی کی موٹی اوڑھنی کا ایک کنارا زور سے پکڑے' گلے میں پڑے ہوئے پھندوں میں سے نہایت مشکل سے آواز نکال کر کہتا "تم اتنی جلدی روٹھ جاتی ہو خانی۔"

اور خانی اسے کھاٹ پر لٹا دیتی۔ اس کا ماتھا چومتی' اس کے آنسو پونچھتی اور جب شام ہوتی تو جمو کے لیے خاص طور پر گھی کی روٹی پکاتی۔ اسے پاس بٹھا کر کھلاتی' اور جب شام سنولا جاتی' اور فضا سے غیر مرئی برف برسنے لگتی تو وہ مٹی کی ایک انگیٹھی میں اُپلوں کا دہکتا ہوا ملبہ ڈال کر کوٹھے میں چلی جاتی۔ چیتھڑوں سے بنے ہوئے دونوں گدوں کو جھاڑتی۔ جمو کو کمبل میں لپیٹ کر انگیٹھی کے سامنے گدے پر بٹھا دیتی' مٹی کے دِیے کی لَو کو تیز کر دیتی اور عجیب و غریب باتیں کرتی:

"جمو بھیا میں سوچتی ہوں' اگر ہمارے ماں باپ زندہ ہوتے تو کیا تب بھی تم مجھے اسی طرح پیارے لگتے؟ اب تو تم میری جان ہو' میرا مال ہو۔ تم جب مدرسے سے چلے جاتے ہو نا تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ دیواریں ہولے ہولے سرکتی آ رہی ہیں' اور میں گھٹی جا رہی ہوں۔ تب مجھے بڑے ڈراؤنے خیال آتے ہیں۔ رنگ رنگ کے چہرے نظر آتے ہیں۔ کئی اتنے خوبصورت جیسے آک کے پھولوں کا گچھا۔ کئی ایسے بھیانک جیسے وہ کونے میں پڑی ہوئی پرانی ہنڈیا۔ اتنے اتنے دانت اور یہ ناخن اور ———"

جمو تلملا جاتا "کوئی کہانی سناؤ خانی۔ بڑی میٹھی سی کہانی ہو۔ تم ایسی باتیں کرتی ہو تو مجھے ساری رات ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی پریوں کی کہانی سناؤ۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خانی کچھ سوچ کر کہتی "اچھا تو اُس پری کی کہانی سنو گے جس نے ایک پھول کو چوما تو وہ شہزادہ بن گیا۔ اور شہزادے کو چوما تو وہ پھول بن گیا اور پھر اسے چومتی رہی، مگر پھول شہزادہ نہ بن سکا اور آخر اس پھول کو پوجتے پوجتے اس کی جوانی ڈھل گئی۔ وہ بوڑھی ہو گئی، وہ مر گئی، اور جب وہ مر چکی تو پھول شہزادہ بن گیا۔"

"ہائے ہائے بے چاری پری" جمو کہتا "دیکھو خانی! دیکھو نا پری مر کیوں گئی۔ کوئی ایسی کہانی سناؤ جس میں پری مرے نہیں۔"

خانی مسکراتی۔ مگر یہ مسکراہٹ ڈوبتے ہوئے چاند کے زہر خند کی سی ہوتی۔ "اچھا تو اُس پری کی کہانی سنو گے جس نے بادلوں کا لباس پہنا، ان پر کرنوں کی کناری ٹانکی، ماتھے پر ستارے چھڑکے، گالوں پر شفق مَلی۔ ایک دُم دار ستارے کو ہوا میں گھماتی پنجاب کے ایک گاؤں میں اتری۔"

"کس گاؤں میں؟" جمو کمبل جھٹک کر انگیٹھی پر جھک جاتا۔

"اسی گاؤں میں" خانی کی آنکھوں میں بجھتے ہوئے تارے جھلملا اٹھتے۔ "وہ اسی گاؤں میں اتری تاکہ کسی عمر بھر کے ساتھی کی تلاش کرے۔ مگر اسے وہ ساتھی نہ مل سکا۔ اسے جو بھی ملا اس کے دل کا ایک حصہ گلا ہوا تھا۔ کوئی بہت بھوکا تھا تو کوئی بہت امیر، کوئی بہت آوارہ تھا تو کوئی بہت نیک۔ اسے کوئی ایسا ساتھی نہ مل سکا جس کا دل، داغوں سے پاک ہوتا۔"

"پھر؟" جمو جیسے انگیٹھی میں گرنے لگتا۔

"پھر؟——میں کیا جانوں۔" خانی دہکتے ہوئے اپلوں کے ملبے پر سے راکھ کی موٹی تہیں کھرچ کر الگ کرنے لگتی۔ "وہ ابھی تک اسی گاؤں میں ہے۔"

"کہاں؟"

"یہاں۔"

"یہاں؟"

"ہاں۔"

"یہاں کہاں؟" جمو سارے کا سارا سوالیہ نشان بن جاتا۔

"اب سو جاؤ۔" خانی حالات کو ایسا خطرناک موڑ کاٹتے دیکھ کر بھنا جاتی اور بوسوں، تھپکیوں اور دلاسوں سے جمو کی پیہم ضدوں کی تلافی کرتی بڑی دیر تک دیے کی رقصاں لَو کو عجیب و غریب صورتیں بدلتے دیکھتی۔

جب اس کے ماں باپ زندہ تھے، تو بھی وہ اپنے آپ کو اکیلی ہی محسوس کرتی تھی۔ اور پھر جب اس کی ماں مر گئی، تو اسے ایک ہم جنس کی جدائی کا احساس ہوا اور وہ باپ اور بھائی کی موجودگی میں اپنے آپ کو بالکل اکیلی سمجھنے لگی۔ اس کا باپ گاؤں کے ان سفید پوشوں میں شامل تھا جو سفید پوشی کی تمام خصوصیات کھو دینے کے بعد بھی رسم و رواج اور رہن سہن کے طریقوں کو نہیں بدلتے۔ اسی وضع داری نے خانی کو سہیلیوں سے بھی محروم رکھا۔ وہ پانی تک بھرنے کے لیے باہر نہ جا سکتی۔ جھیور ہر روز دو گھڑے پہنچا جاتا تھا۔ کبھی کوئی لڑکی اس کے پاس آ بھی نکلتی تو باتوں کا موضوع اس کے صحن کی چاردیواری سے اچھل کر باہر نہ جا سکتا۔ اس کا بوڑھا باپ سامنے دیوار کے سائے میں کھٹولا دھرے زور زور سے کھانستا، اور ان کی طرف گھورتا رہتا۔ جمو سکول سے واپس آتا تو گلی ڈنڈا کھیلنے پھر باہر بھاگ جاتا اور اس ہولناک حد تک بے رس زندگی میں خانی جی ہی جی میں پھڑپھڑاتی اور بھنچی گھٹتی رہتی۔ اور پھر جب اس کا باپ بیمار ہو گیا تو ایک دن خانی کو بلا کر کہا "خانی! تو میرے بعد اکیلی رہ جائے گی، مگر اب تو سیانی ہے۔ تیری ماں بچپن سے تجھے خانی سیانی کہا کرتی تھی۔ اور پھر جمو ہے جو بہت جلد بڑا ہو جائے گا اور——"

اور اس کے بعد بوڑھے نے خانی کو ایک بکس میں چند روپوں کی پوٹلی کا راز بتایا۔ جمو کے جوان ہو جانے تک کفایت شعاری کی تلقین کی، اور مرنے

سے ایک روز پہلے خانی سے کہا "تو بہت بڑے خاندان کی لڑکی ہے اور تیرا خاندان ہمیشہ سارے گاؤں میں بلند رہا۔ اپنے خاندان کو کبھی نہ بھولنا۔ سوکھے ٹکڑوں میں بھی اور ریشمی کپڑوں میں بھی۔ سمجھی میری بیٹی؟"

اور خانی نے بغیر کچھ سمجھے سر ہلا دیا۔ باپ کے مرنے کے بعد خانی کو معلوم ہوا کہ جمو ابھی چھ برس کا ہے۔ اس کے کماؤ بننے سے پہلے وہ بوڑھی ہو جائیگی' اکیلی رہ جائے گی اور وہ اکیلے رہتے رہتے تھک چکی تھی۔ روپوں کی پوٹلی' ٹین اور مٹی کے برتنوں' چنگیروں اور خالی ٹرنکوں کے سوا اور تھا ہی کیا۔ جمو مدرسے سے پلٹ کر آتا تو باہر چراگاہوں میں اپلے چننے چلا جاتا۔ خانی دن بھر صحن میں بیٹھی خوابوں کی جالیاں بُنا کرتی۔ بڑی ہلکی پھلکی اور نرم وگداز جالیاں۔ جن کے نازک تاروں سے جب اس کے شباب کی کرن مس کر جاتی تو یہ جالیاں کوندوں کی طرح جگمگا اٹھتیں اور وہ چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی۔ پڑوسی بوڑھے کھانستے' لڑکیاں چھتوں پر چڑھ کر پیتل کی پراتیں بجاتیں' اور ننھے ننھے گیتوں میں دھوپ کو سایوں پر چھا جانے کی دعوت دیتیں۔ پھر مسجد سے آزردہ سی اذان بلند ہوتی۔ ابر آلود آسمان پر ابابیلیں تیرتیں اور شام کو جب ریوڑ گلیوں میں بھگدڑ مچا دیتے' نوجوان کھیتوں' چراگاہوں اور جنگلوں سے پلٹتے' کوٹھوں میں پیلے دیے ٹمٹمانے لگتے' عورتیں ایک دوسرے کے پہلو میں گھسی ہوئی دن بھر کے دھندوں کی کہانیاں سناتیں تو خانی اپنے آنگن میں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈولتی رہتی۔ جمو اپلوں کی گٹھڑی اٹھائے آتا تو گٹھڑی اتارنے سے پہلے ہی اس سے لپٹ جاتی۔ اور پھر جمو کہتا "میں تیرے لیے بیر لایا ہوں اور "گونگیر" گلابی گلابی' موٹے موٹے۔ کھا تو سہی' صبح تک ہونٹ نہ چاٹتی رہے تو جمعہ خان نام نہیں۔"

وہ بیر اور گونگیر کھاتی' مگر ان کی مٹھاس میں عجیب سی تلخی محسوس کرتی۔ سوچتی' یہ بیر اُن بیریوں کے لاڈلے ہیں جن کے سایوں تلے لڑکیوں نے

اوڑھنیاں بچھا کر دوہے گائے ہیں اور نوجوانوں نے کہنیوں کے بل لیٹ کر مرلیاں بجائی ہیں۔ یہ گونگیر ان معصوم جھاڑیوں کے خزانے ہیں جو چٹانوں میں پھنستی پھنستی اگتی ہیں' دبی دبی رہتی ہیں۔ ہوائیں انھیں چھیڑتی ہیں' بارشیں ان کی جڑوں میں گھس کر انھیں اوپر اچھالتی ہیں مگر یہ ابھرتی نہیں' پھیل جاتی ہیں۔ پھر بھی ان کے خزانوں کو لوٹنے کے لیے شریر بچے اور شوقین گبرو آنکلتے ہیں۔ اف یہ بیر اور گونگیر! یہ بے بس بوٹیاں! —— خانی کے خیالات اچانک ایک اور پگڈنڈی پر ہو لیتے —— اگر یہ بیر اور گونگیر نہ توڑے جائیں تو پک کر گر پڑیں' اور پھر گل سڑ جائیں' مٹی میں مل جائیں۔ بیروں اور گونگیروں کے لوٹے جانے ہی میں ان کا بھلا ہے —— مگر جانے جمو بھیا ہمیشہ بیر اور گونگیر ہی کیوں لاتا ہے میرے لیے!

وہ اکیلی تھی نا اس لیے ہر چیز سے ہمدردی کرتی تھی۔ اس اکیلی بدلی پر اسے بہت رحم آتا تھا جو اداس اداس ادھر ادھر تیرتی رہتی تھی۔ اور پھر جب گرجتی بجتی گھٹا اٹھتی تھی اور اس اکیلی بدلی کو اپنی طرف کھینچ کر اسے اپنے آپ میں مدغم کر لیتی تھی' تو اسے بدلی پر رونا آ جاتا تھا۔ مگر بدلی کا بھلا اسی میں تھا کہ وہ گھٹا میں مل جائے۔ اور بیروں کا بھلا اسی میں تھا کہ انھیں خود بخود گر پڑنے سے پہلے توڑ لیا جائے اور —— اور چونکہ وہ خود بچپن سے اکیلی تھی' اس لیے اسے اپنے آپ پر بھی ترس آنے لگتا۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد تو اس نے پوری طرح گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ کوئی لڑکی آنکلتی تو اس سے جو کی ایڑیوں میں دراڑوں اور اپنے ہاتھ پاؤں کے سن ہو جانے کی باتیں کرتی' یا مٹی کے نئے چولھے گھڑتی' صحن کو آئینہ سا بنا دیتی' کھجور کے پتوں سے چنگیریں تیار کرتی۔ مگر آہستہ آہستہ اسے احساس ہونے لگا کہ وہ خود ہی اپنے آپ کو اکیلی بنائے ہوئے ہے۔ ان جھاڑیوں کے خزانے گل سڑ جاتے ہیں جو ہولناک بلندیوں پر چٹانوں کی چھتوں کے نیچے اگتی ہیں۔ وہ بدلی آخر کار غائب ہو جاتی ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جو بہت دیر تک اپنے آپ کو گھنگھور گھٹا سے بچائے رکھے۔ لیکن گھنگھور گھٹا کی تلاش میں خانی کو بار بار اپنی خاندانی عظمت کا خیال پریشان کر دیتا اور باپ کی وصیت سے ضرورت سے زیادہ گہرے معانی نکال کر اندر ہی اندر گھلتی رہتی۔

جب اکیلا پن اس پر مرض کی صورت میں حملہ آور ہونے لگا تو وہ ایک روز اپنے مکان کے عقب میں ایک تنگ گلی میں سے نہایت تیزی سے گزرتی پڑوس میں چلی گئی۔ اس کے بعد جمو کے باہر جانے کے بعد پڑوس کو جانا اس کا معمول بن گیا۔ وہاں قسم قسم کے قصے چھڑتے اور خانی بھی ہر قصے میں حصہ لیتی۔ وہ لفظوں کو کھینچ تان کر کہیں کا کہیں لے جاتی' زور زور سے ہنستی' سہیلیوں کو ہاتھ سے دھکا دے کر دور لڑھکا دیتی' گیٹیاں کھیلتی' اور جب شام کو پڑوس کے نوجوان کاندھوں پر ہل رکھے' ہاتھوں میں لٹھیں لیے' یا سر پر گھاس کے انبار اٹھائے صحن کے پرلے کونے میں کھاٹیں گھسیٹ کر بیٹھ جاتے' حقے کے کش لگتے' قہقہے بلند ہوتے' ہاتھ پر ہاتھ چٹاخ سے پڑتے' ایک دوسرے کی انگڑائیاں الجھ کر رہ جاتیں' تو وہ یوں محسوس کرتی جیسے اس نے سارا دن ضائع کر دیا۔ کیوں نہ اس نے ایک چنگیر تیار کر لی' کیوں نہ اس نے دیوار پر ٹنگے ہوئے برتنوں کو صاف کر لیا۔ یہ اکیلے پن کا احساس تو کمبخت وہیں کا وہیں رہا۔

گھبرا کر وہ اپنے گھر آ جاتی۔ جمو بیروں اور گونگیروں کو کسی برتن میں سجائے اس کا منتظر بیٹھا ہوتا۔ اور وہ سوچتی' پھر وہی بیر اور گونگیر۔ پھر وہی بیکس جھاڑیوں کے خزانے! مگر ان خزانوں کو لوٹا نہ جائے تو یہ پک کر گر پڑیں' گل سڑ جائیں' مٹی میں مل جائیں——اور پھر انھی بے چین اور کروٹوں بھری نیندوں کا آغاز ہوتا' جماہیوں کا تار بندھ جاتا' انگلیوں کی چٹاک پٹاک شروع ہو جاتی اور صبح سویرے ادھوری شکستہ انگڑائیوں سے نیم روشن کوٹھا لبریز نظر آنے لگتا۔

نوجوان پڑوسنوں میں بیٹھ کر اس نے آس پاس کے دیہاتوں کی بڑی

خوفناک کہانیاں سنی تھی۔ اور حیرت کی بات یہ تھی کہ ہر روز کسی بے تار برقی کے ذریعے سے گاؤں والوں کو کسی نئی واردات کا علم ہو جاتا۔ عورتیں اس پر تصور کے نئے نئے رنگ چڑھاتیں' مبالغے کے غازے سے اسے بناتی سنوارتیں اور جب خانی کو اس نئے حادثے کا علم ہوتا تو یہ اسے بالکل پریوں کی کہانی جیسا ——ایک سپاہی کو دیکھ کر ایک پنہاری بے ہوش ہو گئی اور جب ہوش میں آئی تو کپڑے پھاڑ کر الف ہو گئی۔ باہیں لہراتی' بال بکھیرتی اور لڑکھڑاتی وہ گلیوں کے چکر کاٹنے لگی اور چلّانے لگی "میرا سپاہی! میرا راجہ! میرا دوست"——

لاحول ولا قوۃ۔ خانی سوچتی کیا واہیات بات ہے۔ ایسی محبت بھی کیا کہ خاندانی عزت کا پاس نہ رہے۔ سوکھے گوبر میں اگی ہوئی کونپل مجھے تو کبھی بھلی نہ لگے' یعنی عشق کرنا ہے تو کیا دیوانہ ہونا ضروری ہے۔ اول تو عشق کیا ہی کیوں جائے اور اگر کرنا ضروری ہے تو کیوں نہ شریفوں کی طرح——'

شریفوں کی طرح! خانی کی رگیں جھنجھنا اٹھتیں۔ اس کے سارے جسم میں ایک عجیب سی جھرجھری دوڑ جاتی۔ اس کے انگ انگ سے چنگاریاں نکلنے لگتیں جیسے مکمل انجماد کے بعد اسے آنچ دی جا رہی ہو اور اس کے خون کے جمے ہوئے ٹکڑے رگوں میں ایک دوسرے سے رگڑ کھا رہے ہوں۔ جمو اس سے اداسی کی وجہ پوچھتا تو وہ رونے لگتی۔ کہتی "جمو بھیا! یہ بھی کوئی جینا ہے' یہ بھی کوئی جینا ہے میرے جمو۔"

جمو بھی رونے لگتا "تم تو رونے لگیں خانی۔" وہ منہ بسور کر کہتا۔

اور خانی آنسو پونچھ کر جیسے جی ہی جی میں آئندہ کچھ نہ سوچنے کا نیا عزم کر لیتی۔ جمو کا چہرہ پونچھتی اور اسے کھیلنے کے لیے باہر بھیج دیتی۔ دیوار کے ساتھ بیٹھ کر ادھوری چنگیر کو مکمل کرنے لگتی——میں کچھ نہ سوچوں گی' کچھ نہ سوچوں گی میں——سیدھا پٹھا اس سوراخ میں نہ جا سکے گا اسے مڑنا ہو گا' اور پھر مڑنا ہو گا' اور اس کے بعد پھر مڑنا ہو گا' حتیٰ کہ اس کا سیدھا پن نابود ہو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جائے' اس کی کوئی حیثیت نہ رہے اور اتنی بڑی چنگیر کا ایک حصہ بن کر رہ جائے۔

وہ چنگیر کو زمین پر پٹخ دیتی۔ جھاڑو اٹھا لیتی' برتن مانجھتی' بستر جھاڑتی۔ لیکن یہ سوچ ـــــ یہ گونج ـــــ یہ ازلی و ابدی کرب ـــــ توبہ! اس سے چھٹکارا ناممکن تھا۔ دیوار سے سر ٹیک کر بیٹھ جاتی' اور پھر اسے زور زور سے پتھریلی دیوار پر پٹخنے لگتی۔ درد کے بجائے غنودگی سی محسوس کرتی۔ جیسے اس کے سر کو سہلایا جا رہا ہے۔ کوئی اسے سہارا دے رہا ہے۔ وہ اکیلی نہیں۔ کوئی اس کے قریب ہے ـــــ کوئی! ـــــ کوئی!

اور خانی وہاں سے اس تیزی سے اٹھتی جیسے کہیں قریب ہی اس نے بچھو دیکھ لیا ہے۔ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح صحن میں ڈولتی رہتی اور نیم روشن کوٹھے سے اس کے باپ کی وصیت سانپ کی پھنکار کی طرح ہسہاتی رہتی۔

یہ ساون کا ذکر ہے۔ بھاری بھاری بادلوں کے خیمے ہر وقت تنے رہتے۔ ہوائیں چلتیں' فضا میں نمی تیرتی رہتی۔ اور اگر بادلوں سے بچ بچا کر کبھی سورج نکلتا تو بدحواس سا نظر آتا' جیسے تھک گیا ہے اور پچھم کی طرف لڑھک جانا چاہتا ہے۔ خانی بادلوں کی گھن گرج سن کر جھاڑو سنبھالے چھت پر چڑھ گئی تاکہ کنکروں اور تنکوں کو اکٹھا کر کے گلی میں پھینک دے اور بارش ہو تو پرنالہ بند نہ ہونے پائے۔ وہ چھت پر بیٹھی جھاڑو کو ایک طرف رکھے آستینیں اڑس رہی تھی کہ گلی میں اچانک ایک ہنگامہ سا مچ گیا۔ لپک کر وہ منڈیر پر گئی۔ نمبردار کا بیٹا اسلم مجمع میں کھڑا مسکرا رہا تھا اور کہہ رہا تھا "بھئی حد ہو گئی۔ یہ لڑکا بیروں اور گونگیروں سے جیبیں ٹھونسے آ رہا تھا۔ میں نے یونہی اس سے چند بیر مانگ لیے تو کہنے لگا تم میرے کیا لگتے ہو اور جب میں نے اسے یونہی ڈرانے کے لیے آنکھیں دکھائیں تو رونے لگا اور پھر ایک بات ـــــ یہ بیر اور گونگیر اس نے ہمارے ہی کھیتوں سے جمع کیے ہیں۔ بڑا نازک مزاج چھوکرا ہے!"

"جمو!" خانی منڈیر پر سے چلائی' اور جیسے کسی برقی لہر نے سارے مجمع کے سروں کو پیچھے جھٹک دیا۔ "پھینک دے بیر اور گونگیر۔ معلوم نہیں تجھے؟ ملک صاحب ان کا اچار ڈالا کرتے ہیں۔"

"مگر میں نے تم" ـــــ اسلم نے کچھ کہنا چاہا' مگر جمو نے ٹھنسی ہوئی جیبوں کو اس کے سامنے الٹ دیا' اور پھر زور سے روتا اندر بھاگ آیا اور خانی پیچھے ہٹ آئی۔ بوندیں گرنے لگیں۔ ایک بادل یوں دہاڑا جیسے اس میں ابھی شگاف پڑ جائے گا۔ خانی دیوانوں کی طرح چھت پر سے اتری۔ روتے بلبلاتے جمو کو سینے سے لگا لیا اور بولی۔ "نہ رو میرے بھیا۔ نہ رو میرے جمو۔ روئیں تیرے دشمن۔ روئیں اسلم کے ہوتے سوتے۔ روئیں وہ سب زمیندار جن کے کھیتوں میں بیریں اور گونگیریں اگتی ہیں۔ میرے جمو کا اپنا گھر ہے' اپنا صحن ہے' اپنی بہن ہے' اپنے ـــــ"

لیکن بہن کا لفظ کہتے ہی اس کا ذہن اپنی ہی ذات پر چھا گیا۔ آخر وہ کیا ہے؟ نکمی' اکیلی۔ گاؤں کی دوسری لڑکیاں ہیں۔ دن ابھی مشرق کے پربتوں میں دبکا ہوتا ہے کہ وہ دہی بلو کر مکھن نکال لیتی ہیں' صحن صاف کرتی ہیں' پانی بھر لاتی ہیں۔ دوپہر کو اپنے عزیزوں کے پاس باہر کھیتوں میں چھاچھ کے کٹورے اور باجرے کی روٹیاں لے جاتی ہیں۔ آتے جاتے مل جل کر ساون کے گیت گاتی ہیں۔ ترنجن میں بیٹھتی ہیں۔ پونیوں سے دھاگوں کی صورت میں گیتوں کے سر اور دوہوں کی الاپیں نکالتی ہیں اور شاموں کو نیم روشن کوٹھڑیوں میں گھس کر ایک دوسری کے بازوؤں کو تکیے بنا لیتی ہیں' اور دیر تک کہانیاں کہتی رہتی ہیں' اور جب صبح کو اٹھتی ہیں ـــــ جب صبح کو اٹھتی ہیں ـــــ

اور جب خانی صبح کو اٹھی' تو اس کا بند بند دکھ رہا تھا' جیسے ساری رات بخار رہا ہو' جیسے وہ ساری رات جاگتی رہی ہو۔ مگر یہ عجیب بیداری تھی کہ اسے خوابوں کے سوا کچھ یاد نہ تھا اور یہ عجیب خواب تھے جنھوں نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آنکھوں میں جلن اور رگوں میں شراب دوڑا دی تھی۔ جمو جب ہاتھ منہ دھو کر بستہ سنبھالے مدرسے چلا گیا تو اس کے خوابوں کی دھند سے کل شام کا واقعہ نکلا اور پھر اس واقعہ کا ہیرو جو نہایت نرم لہجے میں کہہ رہا تھا "مگر میں نے تو——" خانی نے اطمینان سا محسوس کیا کہ محض خاندانی شرافت کی حفاظت کے لیے اس نے نمبردار کے بیٹے کو گھرک دیا اور ایک ایسا کام کیا کہ دو تین روز تک چوپالوں اور چوراہوں پر شاید ہی کوئی اور موضوع زیر بحث آ سکے۔

اس روز جب بوڑھا جھیور گاگریں رکھ گیا تو خانی نے گاگروں کی قطار میں سے ایک گاگر چنی، اسے رگڑ رگڑ کر دھویا اور ریشم کے پرانے دوپٹے کا اینڈوا بنا کر سر پر رکھا۔ گاگر کو اینڈوے پر اچھی طرح جما کر وہ چند قدم آنگن میں گھومی، سج سج قدم اٹھاتی اندر آئی، آئینہ سامنے رکھ کر بہت دیر تک گاگر کے زاویے بدلتی رہی، دوپٹے کو اینڈوے کے نیچے یوں اٹکایا کہ ذرا سے جھونکے سے پھڑپھڑا کر ابھرے اور پھڑپھڑاتا ہی رہے۔ گریبان کے ایک بٹن کو ڈھیلا دیکھ کر گاگر اتاری اور پٹاری کھول کر سوئی نکالی، مگر پھر کچھ سوچ کر پٹاری بند کر دی اور بٹن کو اور ڈھیلا کر دیا۔ اتنا ڈھیلا کہ اگر ہوا آئے اور دوپٹہ پھڑپھڑائے اور ساتھ ہی بال گاڑھے دھوئیں کی طرح لہرائیں تو ڈھیلے گریبان سے ہوا گزر کر اس کے چولے میں بھر جائے۔ اور پھر یہ ہوا اس کے جسم سے کھیلے، اس سے لپٹے، اسے سہلائے، اور جب باہر نکل جائے تو دوسرا جھونکا آ جائے۔

بہت دیر تک وہ گاگر کو ایک ہاتھ سے سنبھالے یہ کوشش کرتی رہی کہ اٹھے ہوئے بازو کی آستین خود بخود کھسک کر اس کے گول شانے پر آ رہے، اور نیچے سے اس کی کلائی کی گولائی، کہنی کا گڑھا اور پھر کہنی سے اوپر گلابی گدگدا گوشت مسلسل جھلکیاں مارے، مگر اس قمیص کی آستینیں کمبخت بہت تنگ تھیں، کہنی پر آ کر رک جاتی تھیں، اور سارا بازو——

چھت پر رم جھم سنائی دی۔ پلٹ کر دروازے میں سے جھانکا تو سلیٹی گھٹا جھک کر جیسے پڑوس میں نیم کی آخری پھننگ کو چھو رہی تھی، اور بوندیں بوچھار بن گئی تھیں—— "ہائے ری یہ کمبخت کافر گھٹائیں۔ نہ سوچیں نہ سمجھیں، بس جب چاہا برس پڑیں۔ جیسے انھی کے دادا کی جاگیر ہے ساری زمین، نگوڑی کلموہیاں——" اور گھٹا نے بگڑ کر اپنا سارا خزانہ الٹ دیا۔

خانی نے پنگھٹ پر جانے کے ارادے کو تھپکیاں دے دے کر سلانا چاہا، مگر یہ چونچال بچہ بگڑ چکا تھا، اور باہر مینہ نے قیامت مچا رکھی تھی۔ ایک ایک بوند زمین پر گر کر آدھ فٹ اونچا آبی مینار بناتی تھی۔ بلبلوں کے قافلے بگڑ اور بن رہے تھے۔ پرنالے چلا رہے تھے اور پڑوس میں نیم کی شاخوں نے تناؤ کی سپر ڈال دی تھی۔ ٹہنیاں پتوں کو سمیٹ کر یوں جھک گئی تھیں جیسے بیچاریاں کبھی لہرائی ہی نہیں۔ ازل سے یونہی یتیموں کی طرح سرنگوں ہیں۔ خانی کو ان کمزور ڈالیوں پر رحم آنے لگا، اور پھر اپنے آپ پر بھی——جانے ہر پھر کر خانی اپنی ذات سے کیوں کھیلنے لگی تھی۔ سوچا "نیم کی یہ شاخیں اور جمو کی یہ بہن——دونوں اس بے وقت رحمت کی شکار۔ نہ بارش ہوتی، نہ یہ شاخیں یوں جھکتیں۔ نہ یہ خانی یوں رکتی، لہراتی اور اٹھلاتی گلیوں میں نکل جاتی۔ موڑ پر موڑ کاٹتی، چوپال سے بچ کر دوسری گلی میں چلی جاتی۔ پنگھٹ پر پہنچتی، لڑکیاں خوبصورت گاگر کو حریصانہ نظروں سے دیکھتیں، اور پھر وہ بے نیازی سے اپنی گاگر اِدھر گھماتی، اُدھر چکراتی، اور پانی بھر کر واپس آتی تو بھی چوپال کے قریب سے نہ گزرتی۔ آخر اسے اسلم میاں کی کیا پروا ہے۔ خاندانی عظمت کے لحاظ سے وہ گاؤں کے کسی شخص سے بھی ہیٹی نہیں۔ گھر واپس آ کر——گھر واپس آ کر وہ کیا کرتی——اور خانی نے سوچا جیسے اسے گھر میں کوئی کام نہیں، جیسے اسے اپنی ساری زندگی پنگھٹ پر آنے جانے میں بسر کر دینی چاہیے۔ وہ یونہی سبک سی گاگر سر پر دھرے پانی بھرتی رہے اور چوپال کے قریب سے کبھی نہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گزرے۔

گاگر کو ایک طرف رکھے وہ انھی سوچوں کی دھند میں ٹاکٹ ٹوئیاں مار رہی تھی کہ جمو آ نکلا۔ بستے کو قمیض کے نیچے پیٹ سے لگائے ' تھرتھر کانپتا ' بھیگا ہوا ' نیلے ہونٹ ' ماتھے پر پڑے ہوئے بال ' آستینوں میں چھپے ہوئے ہاتھ "آ گیا میرا جمو بھائی" ——— خانی چلائی ' جیسے اسے اچانک کوئی خزانہ ہاتھ آ گیا ہو۔ "بارش میں کیوں آئے بھیا! تھمتی تو آ جاتے۔"

جمو بستے کو کھاٹ پر رکھ کر بالوں کو نچوڑتے ہوئے بولا "استاد جی کہتے ہیں ' ساون کی بدلی کا کوئی اعتبار نہیں۔ چاہے تو تُلی رہے ' ہفتوں نہ برسے ' اور برسنے پر آ جائے تو ہفتوں برستی ہی رہے۔"

"یعنی یہ بدلی برستی ہی جائے گی؟" خانی نے جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔ اور جمو چولا اتارتے ہوئے بولا "ساون کی بدلی کا کوئی اعتبار نہیں۔"

خانی عجیب سی فکر میں غلطاں ہو گئی۔ گاگر کی طرف دیکھا تو نیم کی شاخوں کی طرح اس پر رحم آنے لگا۔ کیسی اکیلی اکیلی لگتی ہے بے چاری ——— اپنی طرف دیکھا تو ریشمی اینڈوے کو صندوق کے پیچھے کھسکا دیا اور گاگر کو کھاٹ کے نیچے دھکیل کر بولی۔ "یہ گاگر یہاں کیسے آئی؟"

جمو مچل کر بولا "میں نے تو اسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔"

"اور میں نے یہ کب کہا ہے۔" خانی نے اس غیر متوقع دخل اندازی سے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا۔

کھانا پکا اور کھا کر جب خانی فارغ ہوئی ' جمو سے کہا "برسے ہی جا رہا ہے بادل۔"

جمو بولا "تو برسنے دے۔ تجھے اس سے کیا۔ کہاں جانا ہے تجھے؟"

خانی بھڑک اٹھی "بڑبولے! یونہی پوچھ لیا تو آفت کیا آ گئی۔ میرا تو ایسے سے دم گھٹنے لگتا ہے۔ اچھے خاصے آسمان زمین کا ستیاناس کر دیتے ہیں یہ

بادل۔ بس دبک کر اندر ہی پڑے رہو۔"

جمو بولا۔ "سنا ہے مولوی جی کے پاس کلام ہے۔ پڑھ کر چھو کر دیں تو بادل ایک دم پھٹ جائے اور سورج نکل آئے۔"

خانی نے کہا "آج کیوں نہیں پڑھے کلام۔ کس دن کے لیے سنبھال رکھا ہے اسے۔"

"آخر کیوں پڑھیں۔" جمو جیسے خانی کے مقابلے پر اتر آیا تھا۔ "سب کسان کہہ رہے ہیں کہ یہ بارش نہیں خدا کی رحمت ہے۔ فصلیں رنگ لائیں گی۔ اناج کے ڈھیر لگ جائیں گے۔ گھاس اگ آئے گی جگہ جگہ۔"

لاجواب ہو کر خانی دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔ بوندیں ایک لمحے کے لیے رکیں تو جمو باہر بہتی ہوئی گلیوں میں کھیلنے نکل گیا اور خانی پھر اسی سمندر میں ڈوب گئی ' جس میں ہر طرف وہ اپنے آپ ہی کو تیرتا دیکھتی تھی۔ نیچے تہہ میں ' اوپر سطح پر ' ہر طرف ' ہر جگہ!

شام سے کچھ دیر پہلے وہ آگ جلانے کے لیے اُپلے توڑ رہی تھی کہ اچانک آنگن میں سونا پھر گیا۔ لپک کر باہر آئی۔ بادل اوپر اٹھ کر جیسے آسمان سے چمٹ گیا تھا اور مغرب کی طرف بادل کے ایک بہت بڑے شگاف کے عین وسط میں سورج جگمگا رہا تھا۔ جھٹ اینڈوا نکال کر گاگر جمائی۔ دروازہ بند نہ کیا ' سوچا ابھی واپس آ جاؤں گی۔ گلی میں قدم رکھا تو دیکھا کہ گاؤں والے انبوہ کی صورت میں گھروندوں سے باہر نکل پڑے ہیں۔ گھٹنوں تک اٹھی ہوئی تہمدوں کے نیچے کیچڑ بھرے پاؤں چپاچپ بول رہے ہیں۔ قہقہے لگ رہے ہیں ' دھلی ہوئی دیواروں پر چڑیاں بیٹھی چہک رہی ہیں ' جھیور کے تنور کا دھواں مینار کی طرح سیدھا اوپر کی طرف ابھر رہا ہے ' اور بچے بہتے ہوئے پانی میں چھینٹے اڑاتے چیخم دھاڑ مچا رہے ہیں۔

جمو کے خوف نے روک لیا ' مگر نہایت تیزی سے ایک نظر گھما کر سب

بچوں کا جائزہ لے لیا' اور مطمئن ہو کر قدم بڑھائے' مگر یہ انبوہ!——پلٹنا چاہا مگر کئی لوگوں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اور وہ اس معمولی واقعے کو گاؤں بھر کے لیے افسانہ نہیں بنانا چاہتی تھی۔ نیا عزم کر کے تیز تیز قدم اٹھانے لگی تو ایک جوتا کیچڑ میں رہ گیا۔ پلٹ کر اسے سنبھالنا چاہا تو موڑ پر کھڑے ہوئے گبھروؤں کی گھورتی ہوئی آنکھوں سے اس کی گاگر ڈول سی گئی' اور اینڈوا جیسے چٹخنے اور پھیلنے لگا۔ ایک جوتا سنبھالا تو گھبراہٹ میں دوسرا جوتا وہیں رہ گیا۔ دماغ میں تالیاں سی بجنے لگیں' کانوں میں جھینگر سے بولنے لگے۔ دل اچھلنے کودنے لگا۔ گبھروؤں کے قریب سے گزر کر قدم اور تیز کر لیے۔ ایک جگہ ٹھوکر کھائی تو ہنسلی کی گھنگھریاں بج اٹھیں اور اس چھناکے نے بہت آگے جاتی ہوئی پنہاریوں کی ٹولی کو متوجہ کر لیا۔ لیکن خانی پنگھٹ پر اکیلی جانا چاہتی تھی۔ فوراً" ایک اور گلی میں مڑ گئی اور رفتار مدھم کر لی۔ ایک جگہ بھیڑ کی وجہ سے گلی بالکل بند تھی۔ سوچا اب کیسے پلٹوں۔ رک کر ادھر ادھر دیکھا تو آواز آئی "ایک طرف ہو جاؤ بھئی——گزر جاؤ بہن"——تیر کی طرح وہ اس درے سے نکلی تو سامنے مسجد آ گئی۔ مولوی جی ایک چبوترے پر کھڑے سورج کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جیسے منتظر ہیں کہ کب شام ہو اور اذان کہہ دی جائے۔ خانی مسجد کے قریب پہنچی تو بہت آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ خانۂ خدا کا احترام لازمی تھا' اور پھر مولوی جی کو نہایت احسان مندانہ نظروں سے دیکھا جیسے انھی کے کلام کی برکت سے سامنے بادل میں شگاف——مگر سامنے بادل میں شگاف کہاں۔ وہاں تو گہرا کالا رنگ بھر چکا تھا۔ گاگر کو سنبھال کر اوپر دیکھا تو ایک بوند اس کے عین وسط میں آن گری۔ تیز تیز چلنے لگی' مگر اب بوندیں گاگر پر بج رہی تھیں۔ اور پھر اسے اپنا لباس بھیگتا محسوس ہوا۔ گلیاں خالی ہو گئیں' دیواروں پر سے چڑیاں اڑ گئیں۔ اور وہ بھرے گاؤں میں اکیلی رہ گئی۔ اچانک بادل اس زور سے ٹکرائے جیسے بے جان ہو کر زمین پر آ رہیں گے۔ وہ مسجد کی باہر نکلی ہوئی محراب کی

اوٹ میں ہو گئی' مگر اب بوندوں کے بجائے ندیاں گر رہی تھیں۔ پناہ گاہ کی تلاش کرنا چاہی مگر بے سود۔ کسی کے گھر کیسے جا نکلے۔ پڑوسنوں کے سوا اسے اور کون جانتا تھا۔ آخر بغیر کوئی مقام معین کیے محراب کی اوٹ سے نکلی اور آگے بڑھ گئی۔ لباس اس کے جسم سے چمٹ گیا۔ اینڈوا کھل کر لٹکنے لگا۔ بال بھیگ کر ماتھے پر چپک گئے اور دوپٹہ تو جیسے رہا ہی نہیں۔ جیسے چولے کے ساتھ ہی گھل مل گیا ہے اور چولے کا ڈھیلا بٹن' اور پھر عین سینے پر اتنا بڑا شگاف!

ایک لمحے کے لیے اسے بادل کے شگاف میں سورج کا خیال آیا' اور پھر سوچا' سچ مچ اگر کوئی مجھے اس حالت میں دیکھ پائے تو کیا کہے' کیا سوچے' توبہ! اسے پھر کسی پناہ کی تلاش تھی کہ گلی کے موڑ پر اسے نمبردار کی چوپال نظر آ گئی۔ بڑھ کر کھٹکا اٹھایا تو سوچ میں پڑ گئی۔ مگر معاً" بادل ایک مرتبہ پھر ٹکرائے اور اسے جیسے کسی ان دیکھے ہاتھ نے دھکا دے دیا۔ بے تحاشا اصطبل میں گھس گئی جہاں ایک گھوڑا جیسے دیوار سے پار کہیں دور دیکھ رہا تھا۔ خانی نے گاگر ایک طرف رکھ دی' اینڈوے کو نچوڑا' دوپٹے کو قمیص سے الگ کیا' ڈھیلے بٹن کو مروڑ کر تانتی رہی۔ اصطبل میں لید کی بدبو سہی' مگر اس بدبو میں ایک عجیب نرمی اور گرمی تھی جس نے اسے ٹھٹھرنے سے بچائے رکھا' اور وہ وہیں دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔

بارش اسی شدت سے ہو رہی تھی۔ شام اندھیری ہوتی جا رہی تھی اور دم بخود گھوڑا رخ بدل کر خانی کو گھورنے لگا تھا کہ اچانک خانی کو دروازے کے قریب ایک سایہ نظر آیا۔ چور بتی چمکی' اور سیدھی گھوڑے پر پڑی۔ گھوڑا ہنہنایا اور اسلم کی آواز آئی "سب کچھ چٹ کر گیا پٹھا!"

خانی جیسے دیوار میں گھس جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ سمٹی سکڑی' سانس روکے' آنکھیں پھاڑے وہ کبھی چور بتی کی روشنی کے گول دائرے کو' کبھی اسلم کے دھندلے خطوط کو دیکھتی رہی کہ اچانک روشنی گھوم پھر کر خانی پر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پڑی اور پھر اس سے چمٹ کر رہ گئی "آپ یہاں؟" اسلم نے طنزاً" کہا۔

اور خانی مشین کی طرح بول اٹھی۔ "میں۔ میں پنگھٹ پر جا رہی تھی۔ مجھے راستے میں بارش نے آلیا۔ میں۔ میں یہاں بارش سے بچنے کے لیے آبیٹھی' ـــــ خدا کی قسم ـــــ رسول کی قسم۔"

چور بتی بجھ گئی اور اسلم آگے بڑھا۔ خانی کھسکتی ہوئی گاگر پر جا گری اور اسلم بولا۔ "ڈرو نہیں۔ میں اپنے گھر آنے والوں کو دھتکارتا نہیں ہوں۔"

خانی کے دماغ میں تالیاں سی بجنے لگیں اور کانوں میں جھینگر سے چلّانے لگے۔ اسے اسلم سے خوف محسوس ہونے لگا۔ بے جانے بوجھے اس کا ہاتھ چولے کے ڈھیلے بٹن کی طرف اٹھا اور لٹکتے ہوئے دوپٹے کو سنبھالنے کی کوشش میں اس کا ایک پلّو مٹھی میں جکڑ لیا اور بولی۔ "میں جاتی ہوں۔"

"مگر بارش تو اسی شدت سے ہو رہی ہے" اسلم ہولے ہولے باتیں کر رہا تھا۔ "بارش کے رکنے تک تم یہیں ٹھہرو۔"

ایک بار تو خانی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے اکیلے پن کی جو ریاضت کی تھی اس کا اجر ملنے والا ہے۔ خود سپردگی کے نہایت شدید احساس نے اس کے جسم کو بالکل بے جان کر دیا۔ جیسے وہ دنیا میں اکیلی نہیں رہی' جیسے خدا نے اسے بہت طویل اور کڑی آزمائش کے بعد تنہائیوں سے چھٹکارا دلا دیا ہے۔ اس نے چاہا کہ اسلم سے لپٹ جائے' اس کے کندھے پر اپنا سر رکھ دے اور اس سے دوہوں میں باتیں کرے۔ لیکن اچانک اپنے کندھے پر اسلم کے ہاتھ کو محسوس کر کے تڑپ کر اٹھی' گاگر سنبھالتی جھپٹ کر باہر نکلی۔ گھوڑا بھڑک اٹھا۔ اسلم نے ہولے سے کہا "میری جان خانی ـــــ ارے ڈرو نہیں۔" لیکن اس عرصے میں وہ کھٹکے تک پہنچ گئی' اور اسے الانگ گئی۔ گلیوں میں یوں دوڑنے لگی جیسے وہ رقص کے اختتامی چکر میں بے خود ہو گئی ہے۔ اندھیرے میں کئی جگہ کتے بھونکے' کئی دروازوں سے صدائیں آئیں: "کیا ہے؟

کون ہے؟" مگر وہ بڑھتی گئی۔ بازو لہراتی' بال اڑاتی' دوپٹہ پھڑپھڑاتی وہ لپکی چلی گئی۔ اس کا منہ کھلا تھا۔ آنکھیں جھپکنا بھول گئی تھیں اور ہوا ہاتھ میں لٹکی ہوئی گاگر کے منہ میں گھس کر گا رہی تھی۔ قمیص کے شگاف میں سے گزر کر تیز جھونکے اس کے جسم سے لپٹ رہے تھے' اسے سہلا رہے تھے' اس سے کھیل رہے تھے۔

گھر کے اندر قدم دھرتے ہی ٹھوکر کھائی۔ گاگر دھڑاک سے دیوار سے جا ٹکرائی۔ اندر کوٹھے میں دیا جل رہا تھا۔ ڈگمگاتی ہوئی آئی اور چولھے کے قریب میلے گدوں پر سوئے ہوئے جمو پر گر پڑی۔ ہانپتی ہوئی' دھڑکتی ہوئی' لرزتی ہوئی۔

جمو ہڑبڑا کر تڑپا' چلایا اور پھر پکارا "خانی بہن!"

اور خانی اس سے لپٹ گئی۔ اسے چومتی رہی' اور پھر اس کے گال پر گال رکھ کر زور زور سے سانس لیتی بڑبڑانے لگی۔ "میں ڈر گئی تھی جمو بھیا! میں ڈر گئی تھی۔"

❀ ❀ ❀

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھری دنیا میں

ان دنوں تم سچ مچ کنول کا پھول تھیں۔ تمھاری پتیوں پر اگر کوئی بوند گرتی تو صرف پھسل کر گر جانے کے لیے۔ تمھاری پنکھڑیوں کا ہلکا ہلکا گلابی رنگ، جو مرمریں سفیدی میں مبہم سی جھلکی مارتا تھا، بالکل شفق کے مشابہ تھا۔ تم ہنستی تھیں تو صرف اس لیے کہ تم ہنسنے پر مجبور تھیں، مگر تمھارا رونا تمھاری بے لوث ہنسی سے بھی زیادہ لذت آمیز تھا۔ ایک مرتبہ تمھاری جھولی سے مکی کے بھونے ہوئے دانے گر پڑے تو تم بالکل اس بچے کی طرح رونے لگیں، جس کی پتنگ کٹ گئی ہو۔ ایک مرتبہ میں نے تمھیں محض چھیڑنے کے لیے "ظالم" کہا تو تم بت کی طرح جم کر رہ گئیں اور جب میں نے غور سے تمھارے چہرے کی طرف دیکھا تو تمھاری آنکھوں کی کٹوریاں چھلکنے کے لیے پلکوں کی ایک جھپک کی محتاج نظر آئیں۔ ننھے منھے دکھوں پر جی بھر کر رونا اور ذرا ذرا سی بات پر دل کھول کر ہنسنا تمھارے وجود کی محبوبیت کا سب سے موثر عنصر تھا۔

بھادوں کی بھیانک دوپہروں میں تم کتنی دیر تک صرف مجھے دیکھنے کی خاطر چھت پر بیٹھی پرنالہ درست کرتی رہی۔ پوس کی ٹھٹھرتی ہوئی اندھیاریوں میں تم نے ٹڈوں کی چیں چیں سے لبریز کھنڈروں میں میری راہ دیکھی۔ ساون

کے اڈتے ہوئے کہرے میں تم بھیگی ہوئی نگروں پر صرف میرے انتظار میں بیٹھی بوجھل ہواؤں کے تھپیڑے سہتی رہیں اور پھر جب تم میرے قریب ہوتی تھیں تو تمھاری آنکھوں میں چراغوں کی لوئیں کانپنے لگتی تھیں۔ تمھارے دل کی دھڑکن کے ساتھ تمھاری ناک کی بیرونی قوسیں، اور مہین مڑے ہوئے بالوں کے نیچے تمھاری کنپٹیاں اور بکھری ہوئی لٹوں سے ڈھکی ہوئی تمھاری گردن کی رگیں بھی پھڑکنے لگتی تھیں۔ تمھارے ہونٹوں کے گہرے گوشوں میں مسکراہٹ اور لاج کی ہاتھا پائی سبز اودی اور گلابی چوڑیوں کے چھناکے ایک عجیب غیر مرئی سا تسلسل اختیار کر لیتے تھے۔

ان دنوں تم کتنی غریب تھیں۔ تمھارے چولے کے روزنوں میں سے جب تمھارے جسم کا کوئی مستور حصہ نمایاں ہونے لگتا تو تم روشنی کی اس شعاع کو روکنے کی کتنی عجیب و غریب ترکیبیں سوچتی تھیں۔ مگر میری معصوم محبوبہ! بانہوں اور ہاتھوں اور کھلے بالوں سے اگر انسان ستر پوشی کر سکتا تو آج تک اسے لباس کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔ ان دنوں تمھارے سیاہ رنگ کے چولے کی سفید کھدر کی جیب میں بھونے ہوئے چنے ہوتے تھے اور تم پیپرمنٹ کی ایک ننھی سی پڑیا کو ہفت اقلیم کے خزانوں سے زیادہ وقیع سمجھتی تھیں۔

تم نے میرے عنفوان شباب کے باغی اور کوتاہ اندیش تقاضوں کو قدم قدم پر سہارے دیے۔ تم نے میری زندگی کے اس نئے موڑ کو خوشبوؤں اور رنگوں اور روشنیوں سے مزیّن کیا۔ تم نے میری چال ڈھال کی بجائے میرا دل دیکھا جو خالص دیہاتی تھا اور جسے اس حقیقت کا شدید احساس تھا کہ گونجتے ہوئے بازاروں اور گرجتے ہوئے کارخانوں میں انسانی روح پر ایک جعلی سی چپک جاتی ہے، جسے عرفِ عام میں تہذیب کہتے ہیں اور جو دراصل چند ناگزیر مجبوریوں کا ایک نہایت ہی بھونڈا مرکب ہے

---

www.iqbalkalmati.blogspot.com

راجندر سٹریٹ کی منچندہ مینشن کے فلیٹ نمبر ۱۳۔اے کی بیرونی کھڑکی کا دروازہ کھولتے ہی میری نظر تم پر پڑی' یا تمھاری نظر مجھ پر پڑی۔ بہرکیف نگاہوں نے تنگ گلی کی مسافت ضرور طے کی' کیونکہ دو کھڑکیوں کے درمیان دیر تک ایک سنہری تار سا معلق رہا۔ تم اس وقت کھلے بالوں کو پیٹھ اور شانوں پر بکھیرے نیچے گلی میں کسی ظروف فروش سے ایلومونیم کی ایک نہایت بوسیدہ دیگچی کا نرخ طے کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی تم نے کھڑکی کے پٹ بھیڑ دیے مگر تمھارے بالوں کی ایک لٹ باہر لٹکی رہ گئی۔ مجبوراً تم نے کھڑکی کو کھولا اور حیا آلود مسکراہٹ تمھارے لبوں پر بکھر گئی اور ظروف فروش نے چونک کر اور کھڑکھڑاتا ہوا ٹوکرا اٹھا کر کہا "بڑے شہروں میں یہ بڑی خرابی ہے۔"

ان دنوں میں ایک دفتر میں کلرکی کی درخواستیں دے رہا تھا اور تم ایک ہیڈ کلرک کی بیوی تھیں۔ یہ ہیڈ کلرک صاحب اتنے محنتی واقع ہوئے تھے کہ رات کے دس گیارہ بجے دفتر سے واپس آتے اور جب وہ اپنے کمرے میں بتی بجھا کر اور "رام نام ست ہے" کا نعرہ لگا کر سو جاتے تھے' تو تم نہایت دردناک سُروں میں "جس تن لاگے وہی تن جانے" گایا کرتی تھیں۔

ایک دن تم سیڑھیوں میں بیٹھی ایک خوانچے والے سے گول گپے خرید رہی تھیں۔ میں بھی زندگی میں پہلی مرتبہ گول گپّوں کا مزا چکھنے کے لیے وہاں رک گیا۔ دو کھائے اور چھ نالی میں پھینک دیے۔ خوانچے والے نے گھبرا کر ٹوپی ماتھے پر سرکالی اور تم گھونگھٹ میں ہنسی کو لپیٹنے کی ناکام کوشش کرتی رہیں۔ اور جب میں نے اِکنّی نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو تم نے کہا تھا "مجھے آپ کی ایک اِکنّی دینی تھی' وہی بھائی کو دیے دیتی ہوں۔" "لیکن ابھی حساب ختم نہیں ہوا" میں نے کہا۔ اور خوانچے والے نے ہنستے ہوئے ٹوپی کو درست زاویے پر جماتے ہوئے کہا تھا "اِس سنسار میں حساب بھی کبھی ختم ہوا ہے بابو جی! حساب تو سدا چلتا رہے گا۔"

جنگ کے زمانے میں اکنی کی قیمت بہت گر گئی تھی۔ ویسے بھی اکنی صرف چار پیسوں کا مرکب ہوتی ہے۔ مگر مجھے وہ اکنی مرتے دم تک نہیں بھول سکتی جس سے تم نے حساب چکانے کی کوشش کی تھی۔ حکومت بدل جائے' اکنیوں کے کنارے اڑا دیے جائیں' اکنی کا وجود ہی باقی نہ رہے مگر میرے نزدیک دنیا کی تمام حکومتوں کا معزز ترین سکہ اکنی ہے جو دو انسانوں کے درمیان ایک ستارے کی طرح چمکا اور تیسرے انسان کی واسکٹ میں غروب ہو گیا' اور تینوں کی آنکھوں کو چکا گیا۔

ہیڈ کلرک کی اداس بیوی! تم نے مجھے اکنی کے گول گپے کھلائے اور اس کے بعد دیر تک کھڑکی کھولے کوئی کتاب پڑھتی رہیں اور کن انکھیوں سے مجھے دیکھتی رہیں۔ اور پھر مجھے کتاب اور کن انکھیوں کا محتاج نہ پا کر تم مسکرائیں۔ میں نے خلا میں باہیں اٹھا کر ہوا کو سینے سے لگایا اور تم شرما کر پیچھے ہٹ گئیں۔ اور جب رات کو لالہ جی دفتر سے واپس آئے تو خلاف معمول ان کے کمرے کی بتی دیر تک روشن رہی۔ گیت کے بول تمھارے لبوں پر ناچنے کے لیے دیر تک گلی کی نیم اجلی فضا میں پھڑپھڑاتے رہے۔ تمھارے مکان سے ٹھیں ٹھک ٹھیں کی عجیب و غریب آوازیں آتی رہیں۔ اور جب میں صبح کو اٹھا تو مہترانی کی زبانی معلوم ہوا کہ تم صبح چار بجے کی گاڑی سے لالہ جی کے ہمراہ کٹسر چلی گئی ہو اور اب تم وہیں رہو گی' کیونکہ لالہ جی کے خیال میں کٹسر سے باہر پیدا ہونے والا بچہ بھارت ماتا کا بچہ ہونے کا استحقاق کیا' اہلیت ہی نہیں رکھتا۔

نہ جانے تم اب کہاں ہو۔ میرے خیال میں عام شریف ہندوستانی عورت کی طرح اب تک تمھارے گیارہ بچے پیدا ہو چکے ہوں گے اور شاید دو تین کالی ماتا کی بھینٹ چڑھ چکے ہوں۔ چند مستقل طور پر بڑھی ہوئی تلی کے

مریض ہوں' اور باقی اسکول میں "یارب رہے سلامت فرمانروا ہمارا" گا رہے ہوں۔ لیکن یاد رکھو کہ تمھاری یاد کو بچوں کی یہ افراط میرے دل سے محو نہیں کر سکتی۔ تم نے ان دنوں میری طرف مسکرا کر دیکھا جب میں خود مسکراہٹوں کا مفہوم تک بھول چکا تھا۔ میں ان دنوں آوارہ و بدنصیب تھا اور تم بجلی کی سبز روشنی میں میرا بائی اور چنڈی داس کے بھجن اور گیت گاتی تھیں۔ مگر تم نے مجھے محض ایک انسان سمجھ کر چند مسکراہٹیں اور ایک انکی عنایت کی اور اس ہندوستان میں' جہاں خاندان' تعلیم' فیشن اور مغربیت' شخصیت کی تعمیر کے نہایت ضروری عناصر ہیں' انسان سے محض اس کی انسانیت کی بنا پر محبت کرنا الہ دین کے چراغ کی طرح ناپید نہیں ہوا۔ اور میری گول مٹول' زرد رو اداس چشم محبوبہ! تو اسی محبت کی ایک پابہ زنجیر نمائندہ تھی۔

جب میں نے پہلی مرتبہ تمھارا افسانہ پڑھا تو یہی اندازہ لگایا کہ تم خود نہیں لکھتیں بلکہ الفاظ و معانی کے یہ خوبصورت تاج محل اپنے کسی چاہنے والے' یا خاوند یا کسی عزیز سے تعمیر کراتی ہو۔ کون تصور کر سکتا ہے کہ ہندوستان کی عورتیں بھی افسانے لکھ سکتی ہیں۔ وہ عورتیں جنھوں نے عمر بھر ڈیوڑھی سے باہر قدم نہ رکھا' جو چولھے سے بستر تک کے چکر میں عمر بھر گرفتار ہیں' جن کی مسکراہٹیں' ان کے لبوں میں بھنچی رہیں اور جن کے آنسو ان کے آنچلوں میں جذب ہوتے رہے۔ جو تنہائیوں میں روئیں اور تنہائیوں میں ہنسیں۔ جنھوں نے مرتے دم تک اپنی زبان سے اپنے خاوند کا نام نہ لیا۔ جنھوں نے آسمان کو صحن کی وسعت کے ذریعے ناپا اور جن کے لیے چاند بالاخانے کی اوٹ میں جاتے ہی غروب ہو گیا۔ تم ہی سوچو کہ آخر میرا وہ پہلا اندازہ فطری تھا یا نہیں۔

لیکن جب میں نے تمھارا افسانہ پڑھا تو میں تمھاری گلفشاں تحریر سے

اس درجہ متاثر ہوا کہ تمھیں خط لکھ ڈالا۔ تم نے کتنی نرم دلی سے جواب لکھا اور پھر مسلسل خطوط کے برفیلے تکلّفات میں غیر محسوس طور پر بے تکلفی کا شعلہ اس حد تک اتر گیا کہ ہم دونوں کی روحیں جھلس گئیں۔

میں نے تم سے تصویر طلب کی تو تم نے محض اس لیے انکار کر دیا کہ —— "تصویر حقیقت کا محض ایک پرتو ہے' حقیقت نہیں' اور میں انتہا درجے کی حقیقت پرست ہوں۔ میں خدا کو بھی ایک اٹل حقیقت سمجھتی ہوں۔ میرا مذہب حقیقت ہے' میرا فن حقیقت ہے۔"

نئی دہلی کے ایک کافی ہاؤس میں ہم مقررہ تاریخ اور وقت پر اکٹھے ہوئے لیکن میں تمھیں پہچان نہ سکا—— میرے تصور میں جن بڑی بڑی آنکھوں نے چراغ جلائے تھے وہ کہاں تھیں۔ وہ گال کہاں تھے جن کی مرمریں جھلک نے میری خزاؤں تک کو نکھار دیا تھا۔ وہ ہونٹ کہاں تھے جن کے رس نے میری تنہا راتوں میں خمار گھول دیے تھے۔ وہ بوٹا سا قد' وہ چھریرا بدن' وہ لانبے بال—— یہ سب کچھ کہاں تھا۔ میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ آخر تم اپنے اس سرمائے کو کہاں چھوڑ آئیں اور بے پلکوں کی چندھی آنکھیں اور پچکے گال اور پھٹے پھیلے ہونٹ' ٹھگنا قد' بدھا بدن اور بھوسیلی بے رونق جٹائیں کہاں سے اٹھا لائیں تھیں۔ اور پھر تمھارا سیاہ رنگ اور پیلے دانت اور وہ ہولناک تصنع آمیز ٹین کے کنستر کی طرح پھٹی پھٹی بھرائی بھرائی "ہیلو ڈیئر سٹرینجر۔"

اس وقت میں نے سوچا تھا کہ کاش مذہب اور قانون میں خود کشی کرنا جرم نہ ہوتا۔ لیکن اب مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرنا ہے اے حقیقت پرست ادیبہ' کہ تم نے میرے تصورات کو ایک عرصے تک انتہا درجے کی فنکارانہ چابک دستی سے بہلایا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ حقیقت تلخ ہوتی ہے اور تم سے مل کر مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حقیقت سیاہ رو اور بھدی بھی ہوتی ہے۔ لیکن وہ لمحے مجھے کبھی نہیں بھول سکے، جب میں نے تمھیں خطوط کے بجائے کتابچے

لکھے اور اس محبوب مصروفیت کے عالم میں یہ سوچنے کا وقت ہی نہ ملا کہ حقیقت پرست ہمیشہ رومان کی تخلیق کرتے ہیں اور رومانی ہمیشہ انتہا درجہ کے حقیقت پرست ہوتے ہیں اور وقت تیز رفتار ہے اور زندگی مختصر ہوتی ہے۔

تم نے مجھے کیسے عجیب انداز سے دیکھا تھا جیسے مجھے برسوں سے جانتی ہو۔ تمھارے لبوں پر دعوت تھی اور آنکھوں میں خاموش مزاج پرسی۔

کھیت کو کاٹتے جاؤ میرے دہقان بھائیو! درانتیوں کی وحشت میں کمی نہ آنے پائے۔ کھیت کا آخری کنارا تمھارا افق ہے۔ درانتیوں کے ہلال اسی شاداب افق پر غروب ہونے چاہئیں ورنہ تمھاری محنت ادھوری رہ جائے گی اور ادھر ہماری کہانی ادھوری رہ جائے گی اور——اور ادھوری کہانیاں مجھے قطعی نہیں بھاتیں۔ مجھے کوئی ادھوری چیز نہیں بھاتی۔ میں کائنات سے بھی تو اسی لیے مطمئن نہیں کہ اس کے خالق نے جلد بازی سے کام لیا اور ابھی زمین کا طواف کرنے کے لیے چند اُور چاند اور خود زمین کے چند اُور مسجود سورج ڈھالے جا رہے تھے کہ آدم نے گندم کا دانہ کھالیا۔

دہقان اپنے کام میں مصروف رہے' اور تم نے کھنڈر کی اوٹ میں ہو کر اپنی آنکھوں کو ایک عجیب سی حرکت دی تھی' جیسے کہہ رہی ہو: "قریب آ جاؤ" اور جب میں تمھارے قریب آیا تو تم نے ہنستے ہوئے کہا تھا "میں شور مچا دوں گی"——اور ان الفاظ میں کتنی دھڑکتی بھڑکتی ہوئی سرگوشیاں پنہاں تھیں۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ تم اس گاؤں کی سب سے فراخ دل حسینہ ہو' تمھارا نوجوان خاوند لیبیا کے محاذ پر مرچکا ہے اور تم اس گھر میں اکیلی رہتی ہو' جس کی چاردیواری پست ہے اور جس کے دروازے کی زنجیر محض چھونے سے کھل جاتی ہے۔ تم شام کے بعد فوجی سپاہیوں کے پیش کیے ہوئے قسم قسم

کے عطر لگاتی ہو اور تمھارے پاس ایک بستر ہے جو لکھنؤ کے ایک تعلقہ دار نے ایک پنجابی باورچی کو انعام میں دیا اور پنجابی باورچی نے یہ بستر ایک فوجی سپاہی کے ہاتھ چمڑے کی ایک چھاگل کے عوض بیچ ڈالا اور سپاہی نے یہ بستر اس شرط پر تمھارے حوالے کر دیا کہ تم مرتے دم تک صرف اسی کی یاد میں اس پر اکیلی سوؤ اور اگر ہو سکے تو اس پر لیٹ کر رات آنکھوں میں کاٹو اور تارے گنو اور چمگادڑوں کو اڑتا دیکھو۔

اسی بستر پر بٹھا کر تم نے میری جیبوں کی تلاشی لی اور سات روپے سوا سات آنے نکال کر تکیے تلے رکھ لیے۔ اور پھر تم نے میری سگریٹ کی ڈبیا اور رومال اور میرے ایک دوست کی تصویر بھی نکال لی۔

تمھاری محبت سستی اور تمھارا بستر میلا تھا' مگر تمھاری بیباک ہنستی اور چمکتی ہوئی آنکھوں نے مجھے بتایا کہ اگلے لوگ عورت کے متعلق نہایت محدود معلومات رکھتے تھے۔ وہ عورت کی حیا کو اس کے حسن پر غالب سمجھتے تھے اور تم حیا کے احساس سے یکسر عاری تھیں۔ مگر تمھارا جسم خوبصورت تھا۔ تمھیں مرد کو ورغلانے کے سینکڑوں ڈھب آتے تھے۔ اور تم ان لوگوں کی ہنسی تک اڑا سکتی تھیں جو تمھارے شبستان کی رنگینی پر طعنہ زن ہوتے تھے۔ اور اگرچہ گاؤں میں میرا قیام مختصر تھا اور میری موجودگی ہی میں محاذ برما سے چند سپاہی ۲۸ دن کی چھٹی پر آ نکلے تھے اور تمھارے گھر کے قریب سے گزرتے ہوئے ان کی مونچھیں اکڑ جاتیں تھیں اور طرے پھیل جاتے تھے۔ اور پھر ایک رات کو تمھارے دروازے کی زنجیر میرے لیے ہندوستان کے آئینی تعطل کی صورت اختیار کر گئی' مگر تم میرے خیالوں میں مدت سے محو پرواز ہو۔ اس لیے کہ تم روپے سے خریدی جا سکتی تھیں۔ مگر لوگوں کی دھمکیاں اور ہم جنسوں کے طعنے تمھاری مصروفیتوں میں ایک لمحہ کے لیے بھی خلل نہ ڈال سکے۔

---

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گاؤں سے دور' ریت کے سنہری ٹیلوں کے درمیان بہت سی سیدھی اور قوسی کھجوروں کے سائے تلے تمہارے خیمے نصب تھے۔ ٹیلوں کی لہروں پر میں نے تمہارے قدموں کے نشان دیکھے جو مجھے اس کھجور تک لے آئے جس کی ڈالیوں میں بیٹھی تم دف بجا رہی تھیں۔

گوری بال بکھیرے جیسے ساتھی نرم طلائی تاریں[1]
گوری اکھیاں ملیاں جیسے ساتھی تارے جھپکی ماریں

اڑتی ہوئی ابابیلوں نے غوطہ مار کر تمہارے خیموں کا چکر لگایا' لیکن انھیں الھڑ موسیقی کا وہ منبع نہ مل سکا جس سے نقرئی تانوں کے فوارے چھوٹ رہے تھے اور ہوائیں تھم گئی تھیں اور کرنیں جم گئی تھیں اور سائے رک گئے تھے۔ میں نے کھجور کے نیچے پہنچ کر کہا "خانہ بدوش لڑکی! مجھے شہر جانا ہے اور تمہارے خیموں نے پگڈنڈی کو ڈھانپ لیا ہے" —— تم نے کہا تھا "بھولے مسافر! پگڈنڈیاں خیموں سے چھپ سکتیں تو کوئی مسافر منزل تک نہ پہنچ سکتا۔" میں نے کہا تھا "خانہ بدوش لڑکی نیچے اتر کر مجھے راستے پر لگا دے۔ اصل میں پگڈنڈی کا تو بہانہ تھا۔ پرے خیموں کے قریب مجھے چند لداخی کتے نظر آ رہے ہیں اور مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔" تم نے جواب دیا تھا "بھولے مسافر! اگر لداخی کتے ایسے ہی خوفناک ہوتے تو بادشاہوں کو فوجیں رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔" تنگ آ کر میں نے کہا تھا "میں تمھیں ایک روپیہ دوں گا" —— اور تم دف کو نیچے ریت پر پھینک کر گلہری کی طرح کھجور پر سے اتر آئی تھیں۔ اور جب تم اتر رہی تھیں خوبصورت گلہری! تو میں نے تمھیں خوب جی بھر کے دیکھا۔ تم نے بالوں میں کیکر کے پھول سجا رکھے تھے اور تمہارے گلے میں سمندری گھونگوں کی ایک مالا تھی اور تمہاری کلائیوں میں سیپوں کے کڑے تھے اور تمہارے پاؤں ننگے تھے۔ ٹخنوں پر پیتل کی پازیبیں تھیں مگر وہ بجتی

ا۔ خانہ بدوشوں کو تذکیر و تانیث کی غلطیوں کے لیے معاف کیا جا سکتا ہے۔

نہیں تھیں۔ صرف چمکتی تھیں۔ تمہاری گھگری کا بالائی کنارا تمہاری کمر میں پیوست ہو چکا تھا اور تم نے انگیا کا ایک رجعتی نمونہ یعنی ایک چولی پہن رکھی تھی جو ناف کے قریب مختلف رنگوں کے ریشمی دھاگوں کی ایک کمان سی بناتی تمہاری سانولی پیٹھ کی طرف دوڑ گئی تھی۔ اور تمہاری پیٹھ کا رنگ کتنا دلاویز تھا۔ دھوپ کی کرنوں کا رس اور ریتلی آندھیوں کی شدید تیزی اور بے وقت بارشوں کی سوندھی خوشبوؤں نے تمہاری پیٹھ کے علاوہ تمہارے چہرے' بانہوں اور پنڈلیوں کو بالکل چاکلیٹ بنا دیا تھا۔

اُس وقت تمام مرد قصبے میں بھیک مانگنے' ریچھ نچانے اور گیت گانے جا چکے تھے اور خیموں کی پرلی طرف صرف کھیلتے ہوئے بچوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ریت پر پاؤں رکھتے ہی تم نے ہرن کی سی ایک چوکڑی بھری اور دف اٹھا کر میرے پاس آئیں اور ہاتھ پھیلا دیا۔ میں نے کہا "گیت سناؤ گی؟" تم نے جواب دیا "ایک روپیہ اور بھی لوں گی۔" میں نے کہا "مجھے خانہ بدوشوں کا ناچ دیکھنے کا ہمیشہ شوق رہا ہے۔" تم نے جواب دیا "پانچ روپے ناچ کے لوں گی۔" میں نے کہا "میں تمھیں گانے اور ناچ اور لداخی کتوں سے بچانے کے دس روپے دوں گا۔"

تم نے گیت گایا' تم ناچیں' پرلے خیموں سے کئی بچیاں بھاگی آئیں۔ ایک بڑھیا کھسک کر خیمے کے دروازے پر آ بیٹھی اور پھر جب تم نے جسم کے تمام امکانی خموں کو ایک نہایت ہی تیز ناچ میں سمو کر دف پر آخری تھاپ دی اور دف کے بیرونی دائرے پر بندھی ہوئی تانبے کی پتریاں اور گھنگرو چھنچھنا اٹھے' تو میں نے ہولے سے کہا تھا "میں بھٹک جانا چاہتا ہوں' میں راستہ نہیں پوچھوں گا۔"

اور تم مجھے ہاتھ پکڑ کر بھگاتی ہوئی خیموں سے پرے چھوڑ آئی تھیں۔ میں نے کہا "چنچل گلہری! میں کل پھر آؤں گا۔" اور تم نے جواب دیا تھا:

"بھولے مسافر! خانہ بدوش کل کو کیا جانیں۔ وہ صرف آج کے بل پر زندہ ہیں۔ کل یہاں نہ خیمے ہوں گے' نہ لداخی کتے ہوں گے' نہ شاماں ہوگی۔ صرف سرد راکھ کے ڈھیر ہوں گے اور بے شمار قدموں کے نشان۔"

اور پھر تم نے اپنے سکوت کی زبانی کہا تھا "زندگی کے اس کبھی نہ ختم ہونے والے سفر میں مجھے تو ایسی کئی منزلیں ملیں۔ اس رہ گزر میں اَن گنت نخلستان آئے۔ لیکن ہم خانہ بدوش ہیں' ہمارا مذہب سفر ہے' ہماری زندگی سفر ہے' ہماری محبت سفر ہے۔ اور بھولے مسافر! تم مجھے ایسی لالچی نظروں سے نہ دیکھو کیونکہ میں نے جو روپے تم سے لیے ہیں' وہ گیت اور ناچ کی اجرت ہیں۔ اور سائے ڈھلنے کو ہیں اور خانہ بدوش قصبے سے پلٹنے کو ہیں' اور ان کی بالشت بالشت بھر لمبی مونچھیں ہیں اور خونی آنکھیں ہیں اور کانوں میں بڑے بڑے بالے ہیں اور انہوں نے نیفوں میں خنجر اڑس رکھے ہیں۔"

تمہارا پیکر ——— میری خانہ بدوش محبوبہ! ——— میرے تصورات کے کہرے میں کوندے کی طرح لپک جاتا ہے اور وہ لمحہ اب تک میرے ماضی اور مستقبل کو محیط کیے ہوئے ہے۔

"سٹینڈرڈ" کے آئینہ وش فرش پر تمہاری بے قرار مگر متوازن گردشیں اور تمہارے ہونٹوں سے I want to hold your hand کا رستا ہوا فردوسی شہد' ویلیسٹر کے سگاروں اور کریون اے کے سگرٹوں کے اڑتے ہوئے دھوئیں میں ہارپر اور فورروز کی بکھری ہوئی خوشبو میں' کافی اور چائے کے پیالوں سے اٹھتی ہوئی دھند میں فرش کی مرمریں مثمن خشتوں میں' چھت پر Wellcome کے حروف ابھارتے ہوئے برقی قمقموں میں تمہارا ایک وجود بے شمار سایوں میں بٹ کر تھرک رہا ہے' لپک رہا ہے۔ تمہاری راہ میں دیواریں کیوں حائل ہیں۔ تمہاری پرواز میں اتنے خم کیوں ہیں؟ تم ایک

ہی دائرے میں کیوں محبوس ہوئی جا رہی ہو؟ ان دیواروں کو رقص کے ایک وحشیانہ چکر میں تڑاخ سے توڑ دو اور باہر نکل جاؤ۔ سڑکوں پر سے' خیابانوں میں سے اور اکا دکا بنگلوں کے گورکھ دھندے سے نکل کر اور نہر پر سے اچک کر کھلے سبزہ زاروں میں داخل ہو جاؤ۔ بڑھتی جاؤ' گاتی جاؤ حتیٰ کہ زمین کی آخری بلندی سے (اگر زمین گول نہیں ہے) نیلی خلا میں چھلانگ لگا دو' اور ایک ستارے کی طرح ———

مگر نہیں۔ تم "سٹینڈرڈ" کے آئینہ وش فرش پر ناچ رہی ہو اور بار بار میری طرف کچھ اس ڈھنگ سے دیکھتی ہو جیسے میں نہ ہوتا تو سارا "سٹینڈرڈ" ویران رہ جاتا۔ اگرچہ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ حاضرین میں سے ہر شخص کے دل میں یہی گمان گزر رہا تھا۔ مگر "سٹینڈرڈ" کے باہر مال کی پٹڑی پر تم نے اپنا سرسراتا ہوا گاؤن سنبھالتے ہوئے مجھے بڑی احتیاط سے دیکھا تھا اور کار میں بیٹھتے ہوئے ہم نے اپنے ہاتھ کو ویو کیا تھا۔ میرے عقب میں کھڑے ہوئے آر۔ اے۔ ایف کے ایک نوجوان کو شاید مغالطہ ہوا کہ تم اس کی طرف متوجہ تھیں۔ اور جب تمہاری کار اسمبلی ہال کے سامنے سبز روشنی کے سیلاب میں بہہ گئی' تب بھی وہ نوجوان ——— آہ بے چارے انسان کی نادانی ——— چپ چاپ وہیں کھڑا رہا اور سگریٹ اس کی انگلیوں میں بیکار جلتا رہا اور خلا میں اس کی نظریں برے کی طرح گھستی چلی گئیں۔

دوسرے روز تم "سٹینڈرڈ" میں مجھے اپنا منتظر پا کر مسکرائیں اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر نہ جانے کیوں اداس ہو گئیں۔ آرکسٹرا کی طرف ایک نگاہ اٹھا کر تم نے ایڑیوں کو فرش پر پٹخا اور ایک عجیب چنچتا اور بلکتا ہوا آہنگ پیدا کرتے ہوئے تم نے The winner takes it all کی تانوں سے میرے ذہن کو' میرے ماحول کو' میری کائنات کو زندگی کی ان مسرتوں سے معمور کر دیا جو شاید اب سے پہلے میرے لاشعور اداس رقص اور تمہارے اداس انداز کے باوجود

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھٹک گیا۔ میں تمھارے ہمراہ الجیریا کے سنہری ساحلوں پر گھومتا پھرا‘ بحیرہ روم کے نیلے پانیوں پر برق رو کشتیوں میں اُڑا‘ عدن کی پہاڑیوں میں بھٹکا‘ مکران کے بلوچی گیت سنے‘ چوپاٹی کی رومانی شاموں میں نہایا‘ شمالی ہند کے سبزہ زاروں میں ٹہلا‘ برہم پتر کے ڈیلٹا پر ہم بچوں کی طرح ننھی ننھی جھرنیوں پر چھینٹے اڑاتے پھرے اور میں تمھیں امریکہ کی ان گنت جنتوں میں لے گیا جو بحرالکاہل کی بے کنار وسعتوں میں ناریل کی چھتریوں تلے پوشیدہ تھیں ——اور پھر جب آرکسٹرا بند ہوا——جب آرکسٹرا بند ہوا——

تمھاری یاد میری زندگی کی ضامن ہے‘ جس طرح گھنگھور گھٹا کے اندھیرے میں سورج کی چند بھٹکی ہوئی کرنیں ایک لمحے کے لیے دن کا احساس تازہ کر جاتی ہیں۔

میں بیمار ہوں میری رفیقۂ حیات! ڈاکٹر نے مرغن کھانے منع کر رکھے ہیں۔ شلغم کے ننھے ننھے قتلے پانی میں ابال کر اور ان پر سیاہ مرچ چھڑک کر میرے پاس لے آؤ‘ اور پانی کو ایک مرتبہ گرم کر کے ٹھنڈا کر لو‘ اور پودینے کی چٹنی میں انار دانے کی بجائے ہینگ کا مہین سفوف چھوڑ دو۔ اور دیکھو تمھیں کل شام سے زکام ہو رہا ہے۔ لعوقِ سپستاں چاٹ لو۔ یا بنفشہ‘ عناب اور اُسطوخودوس کا جوشاندہ تیار کر لو۔ میں مدت سے انگریزی سیرپ پیتے پیتے مجبوراً" طب یونانی کا قائل ہو گیا ہوں۔ اپنی صحت کا خیال رکھو میری جان! تمھارے بغیر میری زندگی اجڑ جائے گی۔

تکیے کے اردگرد گلاب کے پھول رکھنے سے تمھیں میں نے کئی مرتبہ منع کیا مگر تمھارے کان پر——یہ بہت پرانا محاورہ ہے—— تمھاری گردن پر چیونٹی تک نہیں بھاگتی——گلاب کی خوشبو سے مجھے درد سر کی تکلیف ہو جاتی ہے اور آخر مجھ ایسے دبلے پتلے انسان کے لیے اتنے بڑے پلنگ اور ان پر چار

تکیوں اور اتنے لمبے چوڑے لحاف کی کیا ضرورت تھی۔ بھئی مجھے تمھاری اس عادت پر ہمیشہ اعتراض رہا ہے کہ میں بول رہا ہوں‘ بولے جا رہا ہوں اور تم فرش کو گھور رہی ہو‘ گھورے جا رہی ہو۔ کوئی بات کرو‘ کچھ بولو‘ خفا ہو جاؤ‘ میری بات ماننے سے انکار کر دو۔

تم میرا سویٹر بُن رہی ہو‘ اور اُدھر بچہ رو رہا ہے اور مجھے ایک ضروری ڈرافٹ تیار کرنا ہے۔ حکومت چاہتی ہے کہ دیسی شراب پر مزید ٹیکس لگایا جائے‘ کیونکہ بدیسی شراب ٹھیک طرح نہیں بک رہی۔ ٹیکس کے فوائد کے ہمراہ ہمیں اُس نقصان کا بھی اندیشہ ہے کہ کہیں شراب نوش عدم تعاون کا اعلان نہ کر دیں اور سرکار گھاٹے میں نہ رہے‘ اس لیے کمیٹی نے متفقہ فیصلہ کیا ہے کہ ایکٹ آبکاری کی دفعہ نمبر——! بچہ بدستور روئے جا رہا ہے اور تم بدستور سویٹر بُنے جا رہی ہو اور میرا ڈرافٹ بدستور ادھورا پڑا ہے اور باورچی خانے سے چُپڑ چُپڑ کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ پڑوسیوں کی کتیا ہو گی۔ مجھے پڑوسی بالکل نہیں بھاتے۔ یہ کھوجی‘ یہ مخبر‘ یہ خدائی فوجدار ہر وقت سر پر۔ اور پھر جو پڑوسی کتوں کے شوقین ہوں انھیں——میرا بس چلے تو——جنوبی افریقہ بھیج دوں۔ خدا کی قسم یعنی یہ بھی کوئی شرافت ہے کہ انسان کے استعمال کے برتنوں میں یہ کتے——میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میرے دماغ میں کچھ ہو رہا ہے۔ میرا سر دباؤ۔ یوں‘ یہاں کنپٹیوں کے قریب‘ ماتھے کے وسط میں‘ کانوں کے عقب میں‘ گردن کے آس پاس‘ تالو کے محیط پر——ارے! تمھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ تالو کہاں ہوتا ہے۔ فزیالوجی کی کوئی کتاب تم نے نہیں پڑھی؟ تو پھر تمھیں یہ کیسے معلوم ہو گا کہ تمھارا بچہ جو دودھ پیتا ہے وہ انسانی جسم کی مشینری کے ایک عجیب و غریب پروسس سے کس طرح مختلف شریانوں ——تم شرما رہی ہو‘ بہت اچھا۔ میں ڈرافٹ لکھتا ہوں‘ تم سویٹر بنو اور بچے سے کہو کہ اگر رونا بچپنے کے فرائض میں شامل ہے تو شوق سے روئے مگر ذرا

ڈھب سے' ڈھنگ سے ـــــ ایک گلے سے چار مختلف آوازیں نکلیں تو ـــــ تم کتنی اچھی ہو میری شاہدہ' کتنی اچھی ہو تم۔ تمھارے ہاتھوں سے لہسن اور پیاز کی بو آ رہی ہے۔ ہاتھ صاف کرنے کے بعد چند گھڑیوں کے لیے میرے پاس آبیٹھو۔ آج میں تمھیں جی بھر کے اپنے سینے سے بھینچوں گا اور تمھارے بالوں ـــــ اُفوہ! وہ دیکھو نعیم مٹی پھانک رہا ہے۔ خدا کے لیے شاہدہ سگھڑ بنو' بچے کا خیال رکھو۔ ورنہ کل کلاں بچے کے پیٹ میں مروڑ اٹھے تو الزام مجھ پر نہ دھریو۔

شاہدہ! تم میرے جوتے پالش کرتی ہو' میرے کپڑے دھوتی ہو' میرے لیے کھانا تیار کرتی ہو' میرے پاؤں دابتی ہو اور میری ذرا سی خفگی پر خوب خوب روتی ہو ـــــ تمھارے آنسو دیکھ کر مجھے تم پر کتنا رحم آتا ہے ـــــ اور مجھے اپنی اہمیت کا کتنا شدید احساس ہوتا ہے میری رفیقۂ حیات!

دیہات ویران پڑے ہیں۔ شہروں کی تنگ گلیوں میں تیل کی قلت کے باعث لیمپ نہیں جلتے۔ ادیبوں کو فلم اور ریڈیو اور ترقی پسندی نے نگل لیا ہے۔ قصبوں کی بیوہ عورتیں فوجی مرکزوں میں روڑی ڈھو رہی ہیں۔ خانہ بدوش گروہوں نے تجارت شروع کر دی ہے۔ کافی ہاؤس اور ریستوران کالے بھجنگ بیروں اور بھدے زرد رُو چینیوں سے پٹے پڑے ہیں۔ اور والٹز اور جاز کے بجائے ریڈیو سیٹ شانت مہاساگر کا رونا رو رہے ہیں اور غرا رہے ہیں اور چنگھاڑ رہے ہیں۔ پُر امن گھروں میں کنٹرول کی برکتوں نے صد محاذی جنگ شروع کر رکھی ہے۔ ہر طرف چیخم دھاڑ ہے' افراتفری ہے' دھکم پیل ہے' لوٹ کھسوٹ ہے۔ دنیا کو دلہن بنانے کی کوشش میں اس کے سارے زیور نوچ ڈالے گئے ہیں۔ اس کے چاہنے والوں کے جبڑوں میں لٹکتے ہوئے تازہ گوشت کے قتلے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں انتڑیوں کے جال ہیں اور ان کے گلے میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی کھوپڑیوں کی مالائیں ہیں ـــــ اور تم اتنے روپ دھارنے کے بعد بھی نہ جانے میری دسترس سے کیوں دور ہو۔ اور بادل فضا میں منڈلا رہے ہیں۔ ندی کے کناروں پر اُودے اُودے پھولوں کی بساط بچھ رہی ہے اور ندی کا پانی کروٹیں بدلتا ہوا بہہ رہا ہے۔ مگر تم کہاں ہو؟ اب تم کبھی بھکارن ہو اور کبھی طوائف (بھکارن کے پاؤں میلے ہیں اور طوائف کو پان کی پیک پھینکنے کا ڈھب نہیں آتا) اب تم کبھی بنگال کی فاقہ کش لڑکی ہو اور کبھی ساحلِ مکران کے کسی مچھیرے کی بیٹی (بنگالن کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ہیں اور مکرانی مچھیرن کو مسکرانا نہیں آتا) ـــــ اور مٹھی میں بھری ہوئی ریت روکے نہیں رکتی۔ ننھی ننھی دھاریں بن کر گری جا رہی ہے۔ سائے لمبے ہو رہے ہیں۔ ابابیلیں جھیل سے پرے پربتوں کو عبور کر گئی ہیں۔ جھٹپٹا قریب ہے۔ مگر گھنے جنگلوں' بنجر میدانوں اور ویران پہاڑیوں پر بکھری ہوئی بے شمار انسانی لاشوں کے تعفن نے مشرقی افق کو دھندلا دیا ہے۔ اور ہر طرف کانفرنسوں کا طاعون پھیل رہا ہے۔ اور محبت بے کس اور بے بس ہے اور احساسِ لطیف کو خلا میں کوئی پکار رہا ہے:

"میں اکیلا ہوں' میں اکیلا ہوں۔"

❀ ❀ ❀

اُفق

چلتے رہو، میرے تھکے ماندے ساتھیو! تمھیں ستاروں کا ساتھ دینا ہے۔ اندھیرے کی شکایت نہ کرو، راتیں اکثر اندھیری ہی ہوتی ہیں۔ تم راستے میں ابھرے ہوئے پتھروں سے ٹھوکریں کھاتے ہو تو اپنی بدبختیوں کی داستانیں لے بیٹھتے ہو۔ میرے مضمحل رفیقو! ٹھوکر ہی مدارِ حیات ہے۔ میں نے کتابوں میں یہی پڑھا ہے، بڑے بوڑھوں سے یہی سنا ہے کہ:

اگر خواہی حیات، اندر خطر زی

آس پاس پھیلے ہوئے کھیتوں پر نیندوں کا ہجوم سہی، درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں کے پتے تک چپ چاپ سہی، لیکن میرے عاقبت نااندیش ہم نصیبو! ہوا چلتی ہے تو کھیت سرسراتے ہیں اور پتے بجتے ہیں۔ چاند نکلتا ہے تو اندھیرے کو غاروں اور گپھاؤں کے سوا اور کہیں جائے پناہ نہیں ملتی۔ سو چلتے رہو میرے تھکے ماندے مسافرو، اور سفر کی درازی کی باتیں نہ کرو۔ چیت اور بیساکھ کی ان چاندنی راتوں کی کہانی سناؤ جب تمھاری جوانیوں نے بساطِ حیات پر حیات ہی کی بازی لگا دی تھی اور نارنجی ہونٹوں کے لمس اور کالی بھونرا آنکھوں کی جھپک میں تم نے کانٹ اور غزالی کی ذہنی بھول بھلیاں کا مداوا ڈھونڈا نکالا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھا۔

بھئی خالد! تم نے اپنی بانسری کہاں چھپا لی؟ اوور کوٹ کے کالر اٹھاؤ، ٹوپی کو ماتھے پر سرکاؤ اور آنکھوں کو نیم وا کر کے لکڑی کے اس موسیقی زار کو اَدھر رَس سے سیراب کرو۔ تم موڈ میں نہیں ہو؟ ارے بھئی ہم مسافروں کے لیے موڈ کی مجبوریاں بے معنی ہیں۔ موڈ بنانے کے لیے فرصت چاہیے اور مسافر سے زیادہ کوئی انسان عدیم الفرصت نہیں ہو سکتا۔ خلاؤں کی سرمئی بیکرانیاں بانسری کی نقرئی لہروں کے انتظار میں ہیں۔ ہاں، مجھے تمھاری یہی ایک عادت پسند ہے کہ تم ضدی نہیں ہو۔ تم اپنے احساس کو ایمان کا درجہ نہیں دیتے۔ احساس میں انقلاب کی گنجائش رکھنا ضروری ہے۔ اور ایمان —— سنا ہے —— کسی غیر منقلب جذبے کا نام ہے۔ سنو سنو، بانسری کیا کہہ رہی ہے۔ مسعود کھانسو نہیں۔ تم میرے بہت بیہودہ دوست ہو۔ تمھاری زندگی مجسم کھانسی ہے۔ جھٹکے اور دھماکے اور متعفن مواد کے دھبے۔ تمھارے پھیپھڑے خراب تھے تو تم نے اس طویل سفر پر آمادگی کیوں ظاہر کی؟ اور اب کہ تم ہمارے ساتھ اتنی دور دراز بستیوں تک آ چکے ہو، پھیپھڑوں کی خرابی کا گلہ بے معنی ہے۔ خالد! —— خالد! تمھاری بانسری کے سُر خوابوں سے مملو ہیں اور ہم مسافر خوابوں کے دشمن ہیں۔ ان سُروں کو بلند کرو تاکہ فضا گونج اٹھے اور مسعود کی کھانسی ان سُروں کی رفعتوں تلے دب کر رہ جائے —— سنو مسعود بانسری کیا کہہ رہی ہے۔ کیا؟ بانسری نے کہا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کا کیا مقصد ہے؟! میں نے پہلے بھی تم سے یہی کہا تھا کہ تمھاری زندگی مجسم کھانسی ہے۔ بانسری کے سُروں پر تخلیق کے مقاصد کا پتھراؤ نہ کرو میرے منطقی دوست! مجھے مقصد سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں وجدان کا قائل ہوں اور وجدان مقصد کی غلاظت سے منزہ ہے۔

خالد! تم نے بانسری کیوں بند کر دی؟ ہم پتھریلے موضوعات پر اتر آئے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں اس لیے—— تم بہت حساس ہو میرے بھائی! یہ آبگینہ کب تک اٹھائے پھرو گے۔ آبگینے ہمیشہ ٹوٹنے کے لیے بنتے ہیں' اس لیے انتخاب کڑا ہونا چاہیے۔

اوہ' اندھیرے میں بھٹکی ہوئی ٹیٹری پانی کی رٹ لگاتی گھوم رہی ہے۔ پر جوڑ کر نیچے اتر آ محترمہ! اور اختر کی پلکوں کی جڑوں میں اٹکی ہوئی شبنم سے پیاس بجھا لے۔ اختر! آخر یہ کیا بات ہے کہ تمھاری ہنسی میں بھی آنسوؤں کی سیلن ہوتی ہے۔ تم اس وقت وجدان کے جس تقاضے سے اندھیروں کو چیرتے چلے جا رہے ہو' وہ کتنا مبارک اور مقدس ہے۔ مگر اس وقت بھی میں تمھاری پلکوں کی جڑوں میں ستاروں کی لو سے ایک عجیب مبہم سی چمکیلی دھاری دیکھ رہا ہوں۔ کیا تم نے اب تک اقبال کا مطالعہ نہیں کیا؟ یہ تو میں جانتا ہوں کہ تم ٹیگور پر شیدا ہو۔ میں خود بھی ٹیگور کو انسانی فطرت کے نباضوں میں شمار کرتا ہوں۔ مجھے بھی اس کی خوشبودار نظموں اور منور کہانیوں سے محبت ہے۔ میں بھی جانتا ہوں کہ اس نے قدیم ہندوستانیت کو جدید رنگوں میں نہایت فنکارانہ انداز سے سمو کر بنگالی اور پھر ہندوستانی ادب پر امٹ احسان کیا ہے۔ مگر میرے بھائی! زندگی صرف خوشبو یا صرف آنسو بھی تو نہیں۔ تم زندگی کی جھپٹ اور کڑک اور لپک کو کیوں محسوس نہیں کرتے؟ تم یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ جب جنگ میں ایک سپاہی مرتا ہے تو ساری قوم مر جاتی ہے۔ جب بنگال میں ایک بھوکا دم توڑتا ہے تو ساری انسانیت دم توڑ دیتی ہے۔ جب ایک زمیندار اپنے مزارعہ کی کنواری بیٹی کی عصمت دری کرتا ہے تو ساری کائنات کے چہرے پر سے نیکیوں کا نور نچڑ جاتا ہے۔ اور پھر یہ سپاہی کیوں مرے؟ بنگالی کیوں دم توڑے؟ یہ کنواری کو لٹ جانے سے روکا نہیں جا سکتا؟ تمھاری خاموشی سے یہی معلوم ہو رہا ہے کہ تم پھر رو رہے ہو۔ تم مایوس ہو۔ تم جنگوں' قحطوں اور بداخلاقیوں کو نہیں روک سکتے۔ میں رونے سے نفرت نہیں کرتا۔ رونا آنکھوں

کی عبادت ہے' مگر—— تمھارا رونا! ہر وقت رونا! ہر بات پر رونا!—— مسعود! کیا تمھارا فلسفہ بھی اختر کے آنسوؤں کو خشک نہیں کر سکتا؟ خالد کیا تمھاری بانسری بھی اس زہر کا تریاق نہیں بن سکتی؟—— نہیں؟—— تو پھر یہ سفر کیسے کٹے گا؟

وہ دیکھو' آسمان پر ایک ستارا ٹوٹا ہے' اور اب اس کی وہ روشن لکیر بھی مٹ گئی۔ مگر دوسرے ستاروں کو تو دیکھو۔ کیا ان کے رقص میں کوئی الجھاؤ پیدا ہوا؟ تو میرے بھائیو! پتا گرتا ہے تو درخت کی حیثیت بہرکیف قائم رہتی ہے۔ اختر نے جو کچھ کھویا وہ میں جانتا ہوں۔ مسعود نے جو چرکے کھائے ان کا بھی مجھے علم ہے۔ خالد کی روحانی وارفتگیوں سے بھی میں شناسا ہوں۔ مگر میرے تھکے ماندے رفیقو! تمھاری اداسی اور ماندگی سے دوسرے ستاروں کو کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔ درخت کے دوسرے اَن گنت پتّوں کو کیا پڑی ہے کہ اپنے بھٹکے ہوئے ساتھی کا تعاقب کر کے خود بھی بھٹک جائیں۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ یہ سارے ستارے ایک ساتھ ٹوٹیں اور آسمان کے حکمران کو معلوم ہو کہ ستاروں کے بغیر اس کی دنیا اجاڑ ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ درخت کے سارے پتّے ایک ساتھ گریں اور درخت کو معلوم ہو کہ پتوں کے بغیر وہ اصل میں ایک بدنما ٹُھنٹھ ہے۔

تم جماہیاں لے رہے ہو؟ میں مانتا ہوں کہ میری باتوں میں وہ رس نہیں جو اختر نے اندھیری راتوں کی وسعتوں میں "بنت عم" کی ایک گرم سانس کے مس میں محسوس کیا تھا—— اس مس کا رس اپنی جگہ نہایت لطیف ہے' لیکن کیا تم اب ایک نئے مس سے دوچار نہیں ہو رہے؟ یہ وسیع اندھیرا! یہ ان جانی راہیں! یہ سرگوشیاں کرتے ہوئے کھیت! یہ بڑبڑائے ہوئے کنکر! یہ نرم ہوا کی مشتبہ انگڑائیاں! دور اندھیرے کی ایک گہری قوس کا غماز پھیلاؤ! اور اس پھیلاؤ کے اوپر ایک الاؤ کی چمک کا نیم دائرہ' جو بڑھ رہا ہے' پھیل رہا ہے' اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہمارے لیے اپنی آغوش لحہ بہ لحہ وا کیے جا رہا ہے۔ اس مس کا رس مجھ ایسا غبی بھی محسوس کر رہا ہے اور مسعود! تم خاموش ہو——؟

تم کہتے ہو مسعود کہ محبت کی ناکامی نے تمھیں فلسفے کی تعلیم دی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ تمھارا یہ مفروضہ کہاں تک درست ہے' لیکن اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ دل و دماغ کے خلا کو پُر کرنے کے لیے اگر تم فلسفے کی تعلیم حاصل کرنے کے بجائے لکڑیوں کا ٹال کھول لیتے تو بھی تمھاری گزر ہو جاتی۔ محبت بھی عجیب مہمل جذبہ ہے۔ یعنی اگر تم کو محبت کرنی ہے تو دنیا کے دوسرے تمام کام کاج چھوڑ کر صرف محبت کرو۔ اور محبت ہے کیا؟ یہی آنسو اور آہیں اور آوارگی اور مردنی اور وہ خاص اخلاقی صفت فروتنی—— پھبتیاں سہو' مذاق برداشت کرو' بے مقصد منہ اٹھائے پھرو' مشیّت کے وقت کے اور مواقع کے محتاج رہو اور جب بری طرح تھک جاؤ تو فلسفہ پڑھنے لگو یا بیمہ کمپنی میں نوکری کر لو۔

مسعود شاید تم وہ رات نہیں بھولے ہو گے جب ستلج کا ریتلا کنارا چاندنی میں چمک رہا تھا۔ میں نے تمھیں مشورہ دیا تھا کہ مسعود! وہ نہیں آئے گی۔ شہر سے تین میل دور' کچی سڑک' ہولناک ویرانہ اور پھر رات کو؟ —— دیکھو۔ ڈھیلی ڈھالی لہروں پر ستاروں کے عکس کچھ لکھ رہے ہیں۔ پڑھو پڑھو' اس آسمانی تحریر کو پڑھنے کے لیے صرف بصیرت کی ضرورت ہے—— اور تم نے' میرے فلسفی دوست! بصیرت کا مذاق اڑایا تھا۔ کچی سڑک کے بعید ترین نقطے کے قریب اُگی ہوئی ایک ببول کو تم دیر تک "ناقۂ لیلیٰ" سمجھے بیٹھے رہے۔ تم نے کشتی میں ایک ننھا سا خوبصورت غالیچہ بچھا رکھا تھا جس پر تمھارے ابا شاید نماز پڑھا کرتے تھے اور پھر جب ببول نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی' کیونکہ ببولیں پابہ گِل ہوتی ہیں تو ہم نے غالیچہ اٹھا کر ریت پر دے مارا۔ کشتی کو کنارے سے باندھے بغیر پانی کے حوالے کر آئے اور میرے تعاقب کرنے پر تم

نے پکار پکار کر کہا: "چلے جاؤ۔ خدا کے لیے میرا پیچھا نہ کرو۔ میں اس بیاباں میں بھٹک جانا چاہتا ہوں۔"

میرے خیال میں تمھاری تمنا پوری ہوئی اور تم زندگی کے درمیان میں سچ مچ بھٹک گئے' اور محبت چھوڑ کر فلسفہ پڑھنے لگے۔ مگر کیا تمھیں سکون قلب میسر آیا؟ ذرے میں جہان دیکھنے والے دوست! تم نے اپنے فہم و ادراک کے لیے کتنے خیالی جہنم پیدا کر لیے ہیں۔ کیا ہمارے لیے صرف اسی حقیقت کا احساس کافی نہیں کہ سورج نکلتا ہے تو دن شروع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے تو رات کی ابتدا ہوتی ہے۔ مگر تم نے "دن کیوں" اور "رات کیسے" اور "یہ سب کچھ کیونکر" کی رٹ لگا رکھی ہے۔ حالانکہ سورج کو تمھاری اس رٹ کی کوئی پروا نہیں۔ وہ قیامت تک اسی طرح ابھرتا اور ڈوبتا رہے گا اور تمھاری "کیوں" اور "کیسے" اور "کیونکر" ہزاروں نسلیں گزر جانے کے بعد ادراک کے گھپ اندھیرے میں پھڑپھڑاتی رہے گی۔

کوئی گیت سناؤ خالد! دیکھو تو الاؤ کی قوس پھیل رہی ہے اور ستاروں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ ہوا کروٹیں بدل رہی ہے اور فضا چونک اٹھی ہے۔ کوئی ایسا گیت سناؤ کہ اختر کی آنکھیں ہنسنے لگیں اور مسعود کا جمود ٹوٹ جائے۔

تم نہیں گاؤ گے؟ تم اختر کو نہیں بہلاؤ گے؟ ہمارے اس نڈھال اور مضمحل دوست کو جس نے ابھی چند روز ہوئے اپنی جیتی جاگتی آرزو کو پتھروں میں چن دیا' اور اس دردناک تعمیر میں ایسا مسالہ استعمال کیا کہ اب اس کے تیزابی آنسوؤں کی سیلن بھی پتھروں کے جڑے ہوئے ریشوں کو ڈھیلا نہیں کر سکتی۔ اختر! آخر تمھیں کس نے مشورہ دیا تھا کہ اپنے کسی رشتہ دار کی لڑکی سے محبت کرو۔ کہتے ہیں' مشرق کا معیار اخلاق مغرب سے بہت بلند اور پاکیزہ ہے' اس لیے اے نوجوان شاعر! بھول جاؤ کہ عورت کے گالوں میں گلاب ہیں' اس

کے ہونٹوں میں شفق ہے' اس کی ہنسی میں چاندنی ہے ـــــ لیکن یہ پرانے زمانے کے عرب شعرا' جنھوں نے "بنتِ عَم" کی ایسی گردان چھیڑی کہ اب تک مشرقی شاعری سینکڑوں "بناتِ عَم" کے ناموں کے علاوہ ان کے گالوں' ہونٹوں' آنکھوں اور سینوں کے مرمر اور جسموں کی گدراہٹ سے لبریز ہے ـــــ تم نے اختر! بنتِ عَم سے محبت کر کے کوئی اخلاقی جرم نہیں کیا تھا' مگر میرے بھولے رفیق! یہ تو سوچا ہوتا کہ تم مفلس ہو اور تمھارا باپ مرچکا ہے' اور تمھاری ماں اپلوں کا دھواں پیتے پیتے دمے کی شکار ہونے والی ہے۔ تم ڈسٹرکٹ بورڈ کے دفتر میں کلرک ہو اور تمھیں دفتر کا سیکرٹری اکثر گدھا کہا کرتا ہے۔ طرفین کی رضامندی مشرق کے علم الاخلاق میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہاں صرف دو جنتیں نہیں۔ یہاں شاعر سے لے کر پٹواری تک سب شش جہات کے قائل ہیں۔ تمھارے علاوہ تمھارے والدین ہیں' تمھارا ماحول ہے' تمھارا سماج ہے' تمھارا مذہب ہے' ان کی رضامندی بھی ضروری تھی۔ اور ان کی رضامندی ضروری نہ ہوتی تو آج مشرق کی نگارش لیلیٰ مجنوں' شیریں فرہاد اور ہیر رانجھا کی داستانوں سے محروم رہتی۔ ارے بھائی ہمارے مشرق میں محبت ریاضی کا ایک سوال ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں کا کیوپڈ رسوائے عالم کیوپڈ کا کوئی آزاد کردہ غلام ہے' جس کے پاس صرف ایک تیر ہے اور وہ اپنے آقا کی سنت پوری کرنے کے لیے تیر چلاتا ہے تو ساتھ ہی تیر کا تعاقب بھی کرتا ہے اور اس تیر کو ہدف کے کلیجے میں سے نہایت بے رحمی سے کھینچ کر دوسرے ہدف کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ یہ کسک جو تم اپنے دل میں محسوس کر رہے ہو دراصل محبت کی کسک نہیں۔ یہ کلیجے میں سے زیادہ کھینچے ہوئے تیر کی سوزش ہے جو جلد مٹ جائے گی اور تم ڈسٹرکٹ بورڈ کے محکمہ میں ترقی کرنے لگو گے!

مجھ سے کوئی بات کرو ہمدمو! دیکھو' الاؤ کا دائرہ لرز رہا ہے اور ستارے ڈوبے جا رہے ہیں۔ رات کا نظام زوال پذیر ہے۔ اب اس تخریب

سے ایک نئے اور روشن نظام کی تعمیر ہوگی۔ اسی تعمیر میں ہم اپنا خون کھپانے جا رہے ہیں۔ ہم ایسے دنوں سے تھک چکے ہیں جو صرف بلندیوں کی مستعار شعاعوں سے روشن رہ سکتے ہیں۔ ہمیں ایک ابدی دن چاہیے جس کی روشنی ہمہ گیر اور جس کی وسعت کائنات پیا ہو۔

کون جانے کہ منزل کتنی دور ہے یا کتنی قریب ہے۔ تم بھی نہیں جانتے' مَیں بھی نہیں جانتا' کوئی بھی نہیں جانتا۔ لیکن اس حقیقت سے تمھیں بھی انکار نہیں' مجھے بھی انکار نہیں' کسی کو بھی انکار نہیں' کہ منزل ہے ضرور۔ اور یہ اسی منزل کی قوس ہے جو آسمان کو نگلے جا رہی ہے۔ مسعود! تم کراہ رہے ہو۔ تم بار بار رک کر ایڑیوں کو دباتے ہو اور پنڈلیوں کو سہلاتے ہو۔ تمھارا رنگ زرد ہو رہا ہے۔ تمھارے لبوں کی پپڑیاں اُچٹ کر آپس میں پھنس رہی ہیں۔ تمھاری آنکھوں میں مایوسی کی خلا ہے۔ اور اب تم بیٹھ بھی گئے ـــــ ہمت نہ ہارو مسعود! اٹھو' ارے اٹھو بھئی۔ دیکھو تو ہم سب کے رک جانے سے الاؤ کی ابھرتی ہوئی قوس بھی دبکتی نظر آتی ہے اور پھر ہم سب نے اکٹھے سفر کرنے کا تہیہ کیا تھا۔ تم نے نقشے کی قسم کھائی تھی ـــــ تم بے بس ہو؟ تو آؤ خالد اور اختر ہم اپنے دوست کو اس اندھیرے کے حوالے کر کے آگے بڑھیں۔ مسعود! یہ اندھیرا تمھارا نگہبان رہے گا۔ اور جب تمھیں الاؤ کا پہلا شعلہ نظر آئے گا اور تمھاری اندھیرے کی پناہ گاہ لٹ جائے گی تو اُس وقت ہمارے لیے دعا کرنا اور اعتراف کرنا کہ الاؤ کی اس چکاچوند میں تمھارے تین دوستوں کی آنکھوں کی روشنی اور چہرے کی گلابیاں بھی گھلی ہوئی ہیں۔

اختر! تم بار بار مڑ کے پیچھے کیوں دیکھتے ہو؟ مسعود کو اندھیرے نے نگل لیا' اور اب اگر تم اس کی تلاش میں پلٹو گے تو خود بھی بھٹک جاؤ گے۔ خالد سے بانسری سنو' یا کوئی گیت یا کوئی دھن۔ خالد! سنتے ہو؟ اس وقت ہمارے دوست کو روحانی تھپکیوں کی ضرورت ہے اور تم خاموش ہو۔ بجاؤ یا گاؤ' آخر کچھ تو

کرو کہ تمھارے خیالوں کا باغیچہ ابھی ہرا بھرا ہے۔ تم اپنی محبوبہ کو کالج میں چھوڑ کر آرہے ہو' اس وعدے پر کہ تم بہت جلد پلٹو گے اور اسے لائبریری کے ایک نیم روشن گوشے میں لے جا کر بتاؤ گے کہ پرستان کے ان شہزادوں کی کہانیاں بالکل سچی ہیں جنھوں نے بڑے بڑے جنوں کا مقابلہ کر کے سانپوں کے منہ سے لعل اگلوائے' اور شہزادیوں کی شرطیں پوری کر کے ان سے شادیاں رچائیں۔

خالد! تمھاری محبوبہ کتنی سادہ اور پھر کتنی پُرکار ہے۔ کئی بار اسے یہ بھی علم نہیں ہوتا کہ ماہ رواں جنوری ہے یا فروری اور کئی مرتبہ وہ تمھارے کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک چھوٹی سی ڈبیا میں پڑی ہوئی انگشتری کا حلیہ تک بیان کر دیتی ہے۔ وہ مغربی موسیقی کی دلدادہ ہے اور تم بنگالی سنگیت کو نغمے کی اصل سمجھتے ہو' اس لیے وہ تمھیں بنگالی طرز کے گیت سناتی ہے' اور میں نے تمھیں اکثر انگریزی موسیقی کے بعید از فہم سُروں کی مشق کرتے سنا ہے۔ تم نیلے سوٹ کے ساتھ سفید براق ٹائی لگاتے ہو' صرف اس لیے کہ اس کی نیلی ساری میں سفید پھول ہیں' اور پھر ایک روز وہ اپنی محبوب ساری کے تمام سفید پھولوں پر صرف اس لیے نیلے نیلے کوئی گول نشان لگا لائی کہ تمھارے رومال کے کونے پر سیاہی کا ایک دھبّا گر پڑا تھا۔

اختر! تمھارے قدم بے ترتیبی سے کیوں اٹھ رہے ہیں؟ ٹیڑی تم سے پھر آنسوؤں کی بھیک مانگنے آئی ہے۔ الاؤ کا گھیراؤ تیزی سے ابھر رہا ہے۔ بساط چرخ پر بے شمار ستارے لٹ چکے ہیں اور جو باقی ہیں وہ بھی تھوڑی دیر میں روشنی کے محیط بے کنار میں ڈبکیاں مارتے غرق ہو جائیں گے اور پھر ہماری منزل اپنے خطوط کی پوری وضاحت سے افق کے نیلے پس منظر پر ابھرے گی اور تمھارے قدم خود بخود ایک الوہی ترتیب سے اٹھنے لگیں گے۔

تم کہتے ہو' اب تم میں ایک بھی قدم اٹھانے کی سکت نہیں۔ تو کیا

مسعود کی طرح تم بھی ہم سے کٹ جاؤ گے؟ نہیں تم ایسا نہیں کرو گے۔ اگرچہ تم اداس ہو اور تمھارے دکھ اَن گنت اور تازہ ہیں مگر اختر! تم نے مسعود کی طرح فلسفہ نہیں پڑھا۔ تم وجدان سے دست کش نہیں ہوئے۔ ابھی اس نامعلوم قوت کے قائل ہو جو ستارے کی چمک اور کلی کی چٹک میں آہنگ پیدا کرتی ہے۔ تمھاری روح کی ماندگی یکسر خیال ہے۔ ہمت کرو' میرا اور خالد کا ساتھ دو۔ وہ نقرئی قوس ہماری منتظر ہے۔ وہ ہلکا نارنجی دھندلکا ہمارا منتظر ہے۔ اس دھندلکے کے پیچھے افق ہمارا منتظر ہے۔

تم تو چکرا کے بیٹھ گئے۔ تمھاری ٹھوڑی تمھارے سینے کو اور کندھے کانوں کو چھونے لگے ہیں۔ بہت اچھا' پڑے رہو یہیں' اور انتظار کرو اس لمحے کا جب تمھاری ماندگی ایک نئے عزم کی صورت اختیار کر کے تمھیں اور مسعود کو ہمارے پاس لے آئے گی۔ چلو خالد' اپنے ان بچھڑے ہوئے رفیقوں کے خیال سے ذہن کو خالی کر دو۔ ہم ان تربتوں پر مجاوری کا فرض ادا کرنے نہیں آئے۔

یہ روشنی کی پھوار کہاں سے پڑنے لگی؟ ستارے کدھر گئے؟ اندھیرے نے کہاں پناہ ڈھونڈی؟ اب پگڈنڈی گھنے بالوں کی مانگ کی طرح صاف اور چمکیلی ہے اور پیڑوں کی کونپلوں سے چھنتے ہوئے پھولوں پر مسکراہٹیں برس رہی ہیں۔ پگڈنڈی کے آس پاس گنجان گھاس پر بوقلموں کھیاں اڑ رہی ہیں اور فضا میں پرندوں نے ایک رواں بزم نغمہ جما رکھی ہے۔ یہی وہ وقت ہے جب شاعر کو شعر' مصور کو تصویر اور خالد کو بانسری کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

مگر ٹھہرنا' یہ پگڈنڈی کے اس طرف کھیت کے کنارے کون کھڑا ہے؟ ہوائیں کیوں رک گئی ہیں! فضا کیوں دم بخود ہے! اور مشرق کی طرف سے پھوٹتی ہوئی روشنی کی لہریں ایک ہی نقطے پر کیوں مرکوز ہوئی جا رہی ہیں!

تُو ہم کو حیرت سے تک رہی ہے دہقانی لڑکی! اور ہم تجھے حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ تو ہمارے گرد سے اٹے ہوئے پاؤں اور بے خوابی سے سوجی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوئی آنکھوں کو تک رہی ہے ' اور ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ تیرے ہاتھ میں اگر درانتی کے بجائے پارکر قلم ہوتا تو کیا اچھا رہتا۔ خالد! میں تمھاری بات نہیں کر رہا۔ میں جانتا ہوں کہ ان دنوں تمھارے جذبے و احساس کا کوئی دوسرا وجود حصہ دار نہیں بن سکتا۔ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ اگر اس دھجیاں لگی اوڑھنی اور سیاہ کھدر کے ڈھیلے ڈھالے چولے اور پنڈلیوں کے نصف تک اٹھے ہوئے تہمد کے بجائے یہ لڑکی ساری اور بلاؤز پہنتی اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگاتی ' اور بالوں کو شانوں پر کھلا چھوڑ دیتی تو اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ اب یہ کھیت کی مینڈ پر اس لباس میں کھڑی کیسی اکیلی اکیلی لگتی ہے بیچاری۔ خالد' ویسے تمھارا کیا خیال ہے؟

مجھے تمھاری یہ عادت تو قطعی پسند نہیں کہ تم نے جہاں کہیں کوئی اجنبی لڑکی دیکھی ' جھٹ ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر "اللہ جمیل و یحب الجمال" کا ورد کرنے لگے۔ خدا کے لیے حسن کا کوئی معیار مقرر کرو۔ یہ بھی آخر کیا انداز نظر ہے کہ تمھارے نزدیک پتلے ہونٹوں میں نزاکت ہے اور موٹے ہونٹوں میں دعوت۔ سفید رنگت میں مرمر ہے اور سانولی میں سلونا پن۔ گول چہرے میں "مہتابیت" ہے اور بیضوی میں نسوانیت۔ اور اب یہ لڑکی' جس کے ایک ہاتھ میں درانتی ہے اور دوسرے میں کسی نامعلوم بُوٹی کے ننھے ننھے بے ترتیب پھول' بستر سے اٹھ کر شاید اس نے منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا' تبھی اس کی آنکھوں میں نیند اور بیداری کی جنگ جاری ہے۔ اس کے گالوں پر جوانی کا گلاب بجائے چٹکنے کے چپک کر رہ گیا ہے۔ اور پھر اس کی باہوں اور ٹانگوں میں تم ہالی وڈ کا تناسب کہاں سے لاؤ گے؟——— خالد! خالد! پگڈنڈی سیدھی اُدھر جاری ہے اور تمھارے قدم غلط سمت کو اٹھ رہے ہیں۔ سنبھلو' سنبھلو میرے دوست! کہ منزل قریب ہے اور پگڈنڈی سامنے ہے۔ پلٹ کر دیکھو کہ وہاں کالج کی ہمہ زا وسعتوں میں تمھاری محبت کے مندر کا کلس چراغ کی زبان بن کر

چمک رہا ہے۔ شاعروں کا یہ مقولہ بھول جاؤ کہ حسن کہیں بھی ہو قابل پرستش ہے اور عشق زمان و مکان کا پابند نہیں۔ تم اپنی محبوبہ سے بھی وعدہ خلافی کر رہے ہو اور مجھ سے بھی اور اپنے شباب سے بھی اور ماحول کے ان تقاضوں سے بھی جو تمھیں کالے کوسوں دور میرے ہمراہ لے آئے۔

اب میں اکیلا ہوں اور فضا لا محدود ہے' اور پگڈنڈی سانپ کے سے بل کھانے لگی ہے' اور الاؤ بھڑک اٹھا ہے' آسمان بھڑک اٹھا ہے' سارا افق بھڑک اٹھا ہے۔ کہاں ہیں میرے رفیق کہ اکیلا شخص روتے بھی بھدا لگتا ہے۔ پگڈنڈی الاؤ کے سینے میں گھستی نظر آتی ہے۔ اس الاؤ کو عبور کر کے مجھے اپنے ذہنی تقاضوں کا افق ملے گا اور اسی افق کی دھار میری صدیوں کی پرانی منزل اپنے ننھے ننھے کنگوروں اور گول مول برجیوں سمیت اپنے محرابی دروازے وا کیے میرے انتظار میں ہوگی۔

میری تھکن بے معنی ہے' اور میری ماندگی قطعی بے بنیاد۔ گلے کی رگوں کا تناؤ اور آنکھوں کے سامنے تیرتے ہوئے بادلوں کے سائے اور پگڈنڈی کی کروٹوں پر کروٹیں'——— کیا یہ راستہ ہمیشہ ایک ننھی سی دھاری ہی رہے گا؟ کیا یہ پگڈنڈی ایک کھلی اور سیدھی سڑک میں کہیں نہیں بدلے گی جس پر مجھے کوئی نیا ہم سفر مل جائے' یا جہاں سے کوئی کار گزرے' اور میں اپنی منزل کو توقع سے پہلے پا لوں۔

ٹیٹری پھر اپنی پیاس بجھانے آئی ہے۔ اختر پیچھے رہ گیا ہے محترمہ! اور میرے پاس آنسو نہیں۔ میری آنکھوں میں الاؤ کے شعلے ہیں۔ اب الاؤ ابھر کر فضا میں معلق ہو گیا ہے۔ کھیت لہلہا رہے ہیں' درختوں کی شاخیں رقصاں ہیں' جھاڑیوں پر چڑیاں اور ممولے پھدک رہے ہیں۔ پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ ایک ننھی سی ندی بہہ رہی ہے اور پگڈنڈی پھیل رہی ہے۔ اس پر اَن گنت قدموں کے نشان ہیں۔ یہ کون تھے جو مجھ سے پہلے منزل پر پہنچے۔ آواز دو مجھے میرے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اجنبی دوستو! مجھے پکارو کہ اگرچہ پگڈنڈی ایک صاف اور سیدھی سڑک میں بدل چکی ہے مگر میری پنڈلیوں کے پٹھے کٹ رہے ہیں۔

تم بھول جاؤ کہ ایک شب تمھارے ذہن میں ایک نئی زندگی کا الاؤ بھڑکا تھا۔ اب تمھارا گھسٹ کر رینگنا بے معنی ہے۔ پڑ رہو یہیں' جہاں لاکھوں انسانی ڈھانچے بکھرے پڑے ہیں۔ مکڑیوں نے ان کی پسلیوں میں جالے بن لیے ہیں اور کھوپڑیوں میں گھاس اگ رہی ہے۔ اِس سڑک پر کوئی کار نہیں آئے گی۔ کاریں صرف پکی سڑکوں پر چلتی ہیں اور یہاں گردوغبار ہے' دلدلیں ہیں' کھڈ ہیں' اور الاؤ کے بہت اوپر اٹھ جانے کے باوجود منزل لاپتہ ہے۔ بصارت اور بصیرت دونوں کی کوکھ اندھی ہو چکی ہے۔ افق کی کمان بدستور تنی ہوئی ہے اور تیرانداز ناپیدا ہے۔

❀ ❀ ❀

کرن

والدین اور سہیلیوں میں اپنے متعلق پر اسرار کھسر پھسر سننے سے پہلے اس نے بھرے گھر کی بہاریں دیکھی تھیں۔ ہمجولیوں کے جمگھٹ' بہنوں کے پرے' قسم قسم کی گوری کالی دور و نزدیک کی خالاؤں کے انبوہ۔ لطیفے ہو رہے ہیں' گاؤں کی رنگین سیاسیات پر چٹخارے بھرے جا رہے ہیں' قہقہوں سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ یہاں چٹائیوں پر لڑکیاں رنگ برنگی گیٹیاں کھیل رہی ہیں۔ وہاں اماں ناک پر کپڑا باندھے مرچیں کوٹ رہی ہیں اور پڑوسنیں مارے چھینکوں کے بے حال ہو رہی ہیں' مگر مسجد کے البیلے مولوی کے معاشقے کا قصہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا۔ اُدھر چھوٹی بہن نے گڑیوں کا بیاہ رچا رکھا ہے۔ ننھی منی کڑاہیوں میں حلوے پک رہے ہیں۔ ذرا ذرا سی دیگچیوں میں چڑیا کا گوشت ابل رہا ہے۔ کم عمر مراسنیں چھوٹی سی ڈھولک پر بھولے بھالے گیت گا رہی ہیں۔ ادھر صحن کے ایک کونے میں بھیا اپنے شریر دوستوں کے ساتھ اخروٹ کھیل رہے ہیں۔ ابا حویلی کے ایک سرے پر بڑی سی ڈیوڑھی میں بیٹھ کر حقہ گڑگڑا رہے ہیں اور کھانس رہے ہیں اور نئے تھانیدار کی تعریف میں رطب اللساں ہیں کہ اس نے مرغیاں شکریے کے ساتھ واپس بھجوا دیں' کیونکہ

وہ رشوت کو خلافِ انسانیت سمجھتے ہیں۔ البتہ چھ مہینوں کے لیے ایک شاداب بھینس عاریتاً" طلب کی ہے جو اس عرصے کے بعد ہو بہو اور صحیح و سالم واپس کر دی جائے گی—— "پانچوں انگلیاں کبھی برابر نہیں ہوتیں" ابا کہتے اور بوڑھا مراسی جواب دیتا "ہوتی ہیں جی! بیگو کا جو ہاتھ بلوے میں کٹ گیا تھا نا' اس کی پانچوں انگلیاں برابر ہیں۔"

ایک عجیب بے پروایانہ آسودگی سے اس نے یہ زمانہ گذارا۔ سب سے بڑی اولاد ہونے کے باعث وہ گھر میں جا بجا رعب گانٹھ سکتی تھی۔ منہ مانگی چیزیں حاصل کرتی' من آئی بات کہتی' ہر چیز کا دوسروں سے بڑا حصہ مانگتی اور روٹھ کر پا بھی لیتی۔ سہیلیوں میں رانی بن بیٹھتی۔ ان پر حکم چلاتی اور وہ ریشمی کپڑوں میں لپٹی ہوئی اس گوری چٹی مغرور اور غصیل رانی کی خدمت کرنا عین سعادت سمجھتیں۔ محض شوق سے کبھی پنہاریوں کے ہمراہ پنگھٹ پر جاتی تو صرف ایک گاگر اٹھاتی اور اس کو بجائے تالو کے' ماتھے کے بالائی افق پر جماتی' اور ٹیڑھی گاگر کو ننگے بازو سے تھام کر جب پنہاریوں کے آگے آگے مٹک مٹک کر چلتی اور اس کی ریشمی اودی اوڑھنی ہوا میں سرسراتی اور اس کے بال مچل مچل کر اس کے رخساروں پر کھیلتے تو نوجوان گلیوں کی نکڑوں پر جم کر رہ جاتے اور جب وہ دور نکل جاتی تو کہتے "خدا ہمیشہ فرشتوں سے بیگار نہیں لیتا' کبھی کبھی انسان کا ڈھانچا بنانے کی خود بھی تکلیف کرتا ہے"—— شمو کو خود خدا نے نہ بنایا ہو تو شرط بدلو۔ ارے کہیں ایسی آنکھیں بھی دیکھی ہیں تم نے کہ جس کو دیکھیں اسے غرق کر ڈالیں۔ سبحان اللہ"!

شمو کھاتے پیتے گھرانے کی تھی' اس لیے راہ چلتے کسی نے اس کی ران میں چٹکی نہ لی۔ کسی نے اس کی اوڑھنی کو نہ کھینچا۔ کسی نے اس سے "میری جان" کی سرگوشی نہ کی۔ شام کے بعد جب سہیلیاں اکٹھا بیٹھتیں' باریک گلوں سے سریلے گیت گاتیں' پہیلیاں بجھواتیں اور تھک ہار کر گاؤں کی مفلس

کنواریوں کی عصمت دری فرشیوں اور عشق بازیوں کے قصے چھیڑ دیتیں تو شمو جی ہی جی میں اپنے ٹھٹنے پر فخر کرتی کہ وہ صرف گھر ہی کی رانی نہیں' بھرے گاؤں کی شہزادی ہے' جسے دیکھ کر نوجوان آنکھیں جھکا لیتے ہیں اور بوڑھی کٹنیاں اس کے قریب سے گزرنے پر چھپکلیوں کی طرح دیواروں سے چمٹ کر رہ جاتی ہیں!

والدین اور سہیلیوں کی کھسر پھسر کی طرف اس نے اول اول تو کوئی توجہ نہ دی مگر ایک روز اچانک اسے راجو کی زبانی معلوم ہوا کہ گاؤں میں اس کی منگنی کے چرچے ہو رہے ہیں۔ باپ نے شہباز کو اس کا منگیتر چنا ہے اور ماں ابھی تک اڑی ہوئی ہے کہ شہباز برما کی لڑائی سے واپس آتے ہی کچھ ایسا بیمار پڑا ہے کہ سنبھلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ روز بروز اس کے جسم سے گوشت اور چربی جھڑتی جا رہی ہے اور کمزوری کی وجہ سے اس کی ناک کا بانسہ طوطے کی چونچ کی طرح مڑ گیا ہے—— "میں اپنی لاڈلی کو شہباز کے حوالے کرنے سے پہلے سنکھیا کی پڑیا کیوں نہ دے دوں"—— راجو نے شمو کی ماں کی زبان سے افواہوں کو سمیٹنا شروع کیا: "تمہارا بھتیجا ہے' یہ میں مانتی ہوں۔ تم نے مدتوں پہلے خدا بخشے بھائی اللہ یار سے اس رشتے کا وعدہ کیا تھا' یہ میں جانتی ہوں۔ پر جب پتیوں میں سے بچھو کا ڈنک صاف نظر آ رہا ہے تو پھول توڑنے میں کہاں کی دانائی ہے'—— اور شمو بہن! تمہارا ابا کہتا ہے کہ میری ناک کٹ جائے گی اور تمہاری اماں کہتی ہے کہ میں کسی گگر پر سے چھلانگ لگا دوں گی اور سنا ہے شہباز کہتا ہے کہ چچا کی شرافت کا امتحان ہے۔ دیکھوں بیمار بھتیجے کے گھر کا چولہا وہ کب تک ٹھنڈا رکھے گا۔"

شمو تو کبھی چولھے کے قریب تک نہ پھٹکی تھی اور جس روز ترنجن میں سہیلیاں اکٹھی ہوتیں اور شمو کو ان کے لیے کھانا تیار کرانا ہوتا اور وہ بھولے سے چولھے کے قریب کفگیر ہلانے جا بیٹھتی' تو لمحہ بھر کے بعد اچھل کر پرے جا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گرتی "ہائے ہائے" وہ گلابی چہرے پر دونوں ہاتھ مل کر کہتی "جانے کیسے بیٹھے ہو تم لوگ چولھے کے پاس۔ میں تو رات بھر سلگتی رہوں گی اللہ قسم۔"

——— اور شہباز کو اس کی ضرورت محض اس لیے تھی کہ اس کا چولھا مدتوں سے ٹھنڈا تھا۔ اس کے ماں باپ مر چکے تھے۔ بہن پردیس میں بیاہی جا چکی تھی اور سرکار سے اسے آٹھ روپیہ ماہانہ پنشن ملتی تھی۔ اور زمینوں میں سے سال بھر میں جو غلہ آتا تھا' وہ آدھ برس گذرنے کے بعد غائب ہو جاتا تھا

——— اور پھر شہباز جنگ پر جانے سے پہلے بڑا بانکا سجیلا موہنا گبھرو تھا تو کیا ہوا

——— اب تو ان کی ناک پر مکھی بیٹھ جائے تو دیر تک مزے سے بیٹھی پر سنوارتی رہتی ہے اور شہباز میاں میں ہاتھ ہلانے کی بھی سکت نہیں ہوتی۔ اور اگر ابا نے چچا مرحوم سے وعدہ کیا تھا تو کیا وہ آسمان سے اتری ہوئی ———!

"شمو بیٹی! اس کی ماں نے اسے پکارا۔ خیالوں کی گٹھڑی کو راجو کے پاس کھلا چھوڑ کر وہ ماں کے پاس گئی۔ دودھ کا گلاس لے کر وہ باپ کے پاس پہنچی۔ دونوں حواس باختہ سے نظر آ رہے تھے جیسے کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر کہنے پر قدرت نہیں رکھتے۔ جیسے ان کے جذبات ان کی آنکھوں میں اتر آئے ہیں۔ مگر پلکیں جھپکائے جاتے ہیں کہ شمو ان کی جھلکی نہ دیکھ پائے——— باپ نے دودھ پی کر ہونٹوں کو مَلا اور بولا۔ "جیتی رہو بیٹی' قسمت کی دھنی رہو"——— واپس آ کر گلاس ماں کے ہاتھ میں تھمایا تو وہ بولی "جیتی رہو بیٹی' بھاگ چمکیں تمہارے"——— اور جب وہ راجو کے پاس آئی تو خیالوں کی بکھری ہوئی گٹھڑی کو سمیٹنا چاہا' مگر بے خیالی میں اس انبار کو نئے نئے چیتھڑوں سے ابھارنے لگی——— ابا کو آج ہی قسمت کا خیال کیوں آیا——— ماں کو آج ہی میرے بھاگوں کی چمک کیوں یاد آئی——— اور پھر وہ بھاگ خاک چمکیں گے جو آس پاس سے امنڈتے ہوئے بادلوں میں طلوع ہوں۔

"گاؤں کی کوئی تازہ بات سناؤ راجو۔" اس نے سہیلی سے پوچھا۔

"یہی تو تازہ بات ہے" راجو بولی "جس گھر میں جاؤ' یہی شمو اور شہباز کا قصہ چل رہا ہے۔" اور ایک گاؤں ہی میں نہیں' شمو کے احساسات کی ساری کائنات میں یہی قصہ بہت دنوں چلتا رہا۔ اس کی تمنا تھی کہ کوئی خدا کا بندہ اس کے والدین کو اس کے من کی الجھن سے خبردار کر دے اور اگر ایسا کوئی نہیں تو والدین کو ایک خواب ہی دکھائی دے جائے جو انھیں خبردار کر دے کہ اگر یوں ہوا تو جانے کیا ہو جائے گا۔ مگر ذاتی پندار کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ اس نے کسی سہیلی تک سے یہ بات نہ کہی۔ اور پھر ایسے سچے خواب اس دور میں یا تو گاندھی جی دیکھتے ہیں یا خواجہ حسن نظامی۔ اندر ہی اندر اس نے کئی فیصلے کیے اور پھر ان پر خط تنسیخ کھینچ دیا۔ موم کی مریم کی طرح گھلنے لگی' مگر ابا امی کو شادی کی تیاریاں اس کی طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دیتی تھیں۔ کپڑوں کے انبار آتے اور امی کے کمرے میں ہولناک بکس انھیں ہضم کر جاتے۔ شکر کی بوریاں آتیں اور اندر اندھیری کوٹھڑی کے پیٹ میں غرق ہو جاتیں۔ سنار نے تو جیسے ڈیوڑھی کے باہر ہی دکان ڈال لی تھی۔ ہر وقت جھکی ہوئی مونچھوں کو باچھوں میں لیے وہاں موجود رہتا۔ کوئی نیا حکم سن کر بھاگم بھاگ پلٹتا اور پھر ایک اور ڈبیا لے کر دروازے پر "میاؤں" سے کچھ بولتا۔ ابا لپک کر باہر جاتے' کھسر پھسر ہوتی۔ ابا پلٹتے' باچھیں کھلی ہوئی' آنکھوں میں چراغ جلتے ہوئے ——— "لے آیا؟" امی پوچھتیں "دیکھو گی تو یقین مشکل سے آئے گا۔" ابا کہتے اور پھر اندر کوئی بھاری بھرکم بکس چنگھاڑتا اور اِدھر شمو کے اعصاب تن کر سارنگی کے تاروں کی طرح لرزنے لگتے۔ اس کے دماغ میں تیز ہواؤں کی سی غیر مختتم سیٹیاں بجتیں۔ اس کی کنپٹیوں میں تانبے کی پتریوں والی دفیں جھنجھناتیں۔ وہ بے قرار ہو کر پلنگ پر کروٹیں بدلنے لگتی اور اگر راجو موجود ہوتی تو کہتی "راجو کیسی غضب کی گرمیاں پڑ رہی ہیں۔ میں تو کہتی ہوں اگر کچی بوٹی باہر دھوپ میں رکھ دی جائے تو آن کی آن میں کباب بن جائے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہاں" راجو کہتی "کچے گوشت سچ مچ جل رہے ہیں اِن دنوں۔ میں اِن آنکھوں سے جلتا ہوا گوشت دیکھ رہی ہوں۔ رس نچڑ رہا ہے، ریشے اکڑ رہے ہیں اور سرخی زردی میں بدلتی جا رہی ہے اور اگر یہ زردی سیاہی میں بدلنے لگی——اگر سیاہی میں بدلنے لگی یہ زردی——تو—— شمو بہن ——بات یہ ہے کہ اگر——"

مگر شمو چاہنے کے باوجود نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اس کا ہمراز بنے اور اس سے ہمدردی کرے۔ ہمدردی کمزوروں ہی سے کی جاتی ہے نا، اور شمو اپنے آپ کو کتنی ہی مظلوم تصور کرے وہ کسی کی محتاج نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اور پھر محتاج بھی ان سہیلیوں کی جن کی حیثیت اس کے نزدیک خادماؤں سے زیادہ نہ تھی، اور جن کو گھرک دینے کے بعد اس کے دل میں دلاسا دینے کا جذبہ کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔

"کیسی فضول باتیں کرتی ہو راجو" شمو چاند کو پھیلی ہوئی انگلیوں سے چھپانے کی کوشش کرتی۔ "تم تو اِن دنوں ہر بات کو کچھ ایسے بل دیتی ہو کہ کچھ پلے نہیں پڑتا۔ میں نے بات کی گرمی کی اور تمہیں زردیوں اور سیاہیوں کی یاد آنے لگی۔ کوئی نئی بات سناؤ۔"

"نئی بات؟" راجو حیران ہو کر کہتی "نئی بات تو بس یہی ہے کہ تمہارے اماں اب مان گئی ہیں اور شہباز نے دعوت کے لیے دیگیں جمع کرنا شروع کر دی ہیں۔"

پھر وہی بات! شمو تکیے کو دوہرا کر کے اور پھر تہرا کر کے کہنی تلے رکھتی، پریشان ہو کر پہلو بدلتی تو تکیہ اچھل کر پرے جا گرتا۔ دروازے پر ستار کی میاؤں سنائی دیتی اور پرلے کمرے میں بھاری صندوق چنگھاڑ کر خاموش ہو جاتا۔

وہ بچپن سے شہباز کے ساتھ کھیلی تھی لیکن بچپن کی باتیں یاد کرنے کی اسے کوئی ضرورت نہیں پیش آئی تھی۔ کیونکہ بچپن سے لے کر اب تک اس کی زندگی قطعی ہموار تھی اور دور چیزیں بلندیوں سے نظر آتی ہیں یا پستیوں میں یاد آتی ہیں۔ مگر اب اچانک اس کے ماضی کی کتاب کے بہت سارے ورق ایک ساتھ الٹ گئے اور اسے شہباز کے متعلق ایسی باتیں یاد آنے لگیں جو اس کے ذہن کے نہ جانے کس کونے کھدرے میں مدتوں سے دبکی بیٹھی تھیں۔ اسے اچھی طرح یاد آ گیا کہ شہباز نہایت بانکا لڑکا تھا۔ کھیل کود کے بعد جب سب لڑکے لڑکیاں تالاب کے کنارے توت کی چھاؤں تلے جمع ہوتے تو شہباز عمر میں سب سے بڑا ہونے کے علاوہ حسن اور بانک پن کے باعث صدرِ محفل بن بیٹھتا۔ "پہیلیاں پرانی تھیں، لطیفے چھچھورے تھے، گیتوں کے سُر بے ڈھنگے تھے، نوراں کی آواز ایسی تھی جیسے کورا لٹھا پھٹ رہا ہو اور سعید کے گلے میں جیسے مینڈک دبک کر بیٹھ گیا تھا۔ بڑی بے لطفی رہی، کھیل کود کا سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔ اب بات یہ ہے کہ یہاں سب سے اچھا گانے والا اور سب سے اچھا گانے والی مل کر ایک گیت گائیں اور سب کی تھکن دور کریں——اچھا گانے والا تو یہ رہا"——اور وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارتا——"اور سب سے اچھی گانے والی——" وہ اِدھر اُدھر دیکھتا۔ لڑکیاں اس کی نظروں کا تعاقب کرتیں اور بندوں کے خوشے ان کی گردن کی ہر حرکت پر مسکرانے اور جگمگانے اور تھرتھرانے لگتے۔ توت کے تنے کے پیچھے چھپی ہوئی شمو پر سب نگاہیں جم جاتیں ——"نہیں گائیں گے۔ ہم نہیں گائیں گے۔"—— اور وہ چیختی ہوئی تالاب کے کنارے کنارے بھاگنے لگتی۔ لڑکیاں اوڑھنیاں گراتی، لہنگے سنبھالتی اس کے پیچھے دوڑتیں، اسے پکڑ لیتیں۔ وہ بل کھاتی زمین پر لوٹ جاتی۔ سر جھٹکتی اور توت کی چھاؤں تلے آ کر رو دیتی۔ اس کے پیٹ میں گدگدیاں ہوتیں۔ آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے پر مسکراہٹوں کی کلیاں چٹکتیں اور وہ

کہتی "اچھا سب آنکھیں بند کرلیں تو گائیں گے"!
"کان ہی کیوں نہ بند کرلیں" کوئی کہتا اور شمو پھر بگڑ جاتی۔ آخر بڑی رد و کد کے بعد شہباز اور شمو مل کر ایک گیت گاتے:

اَسی اِتھے تے ڈھول لھوری
نِمی نِمی تے گھُل پئی لوری
سی پیا لگنا
ڈھولا[1]

اَسماناں اُڈدی ال وے
تیرا کیہڑی کڑی تے دل وے
سبھے کنواریاں
ڈھولا[2]

پرلی طرف سے کسی بوڑھے کی ہانک سنائی دیتی —— "ہو جاہلو' شرم نہیں آتی ایسے فضول گیت گاتے ہوئے۔ ارے بدماشو! دوزخ میں جلو گے"!
اور سب توت کی چھاؤں سے اٹھ کر یوں بھاگ کر تتر بتر ہو جاتے جیسے تیز ہوا میں پھولوں کی پتیاں۔
شمو کو ایک اور واقعہ اپنی پوری تفصیل سے یاد آنے لگا۔ شہباز نے اس وقت مڈل کا امتحان پاس کیا تھا اور اس کے چچا نے اپنے بھتیجے کی کامیابی پر گاؤں کے لڑکوں میں کئی من گڑ بانٹ دیا تھا۔ جب ہنگامہ ختم ہوا اور شہباز واپس گھر جانے لگا تو ڈیوڑھی کے ایک کونے سے آواز آئی۔ "شبو! مبارک!"

۱۔ ہم یہاں ہیں اور ہمارے محبوب لاہوری ہیں۔ بوندا باندی ہو رہی ہے' پروا چل رہی ہے اور ہمیں سردی لگ رہی ہے۔ ہائے اور محبوب!

۲۔ آسمان پر ایک چیل اڑی جا رہی ہے' تو ان لڑکیوں میں سے کسے چاہتا ہے' یہ سب دوشیزائیں ہیں اے محبوب!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ننھی شمو ایک کونے میں دبکی ہوئی شرارت سے اسے گڑ دکھا رہی تھی۔ "تو بھی گڑ کھا رہی ہے؟" اس نے شمو کو بازو سے پکڑ لیا۔ "چل تجھے میں مصری کھلاؤں گا اور مکھانے اور گولیاں" —— وہ اسے گاؤں کی سب سے پرانی دکان کے مالک سب سے بوڑھے سکھ کے پاس لے گیا۔ مصری اور مکھانوں اور گولیوں سے اس کی جیب اور جھولی بھر دی۔ واپسی پر شمو سے کہا "شمی! میں اب شہر جا رہا ہوں پڑھنے کے لیے۔ دس پاس کر کے فوج میں بھرتی ہو جاؤں گا۔ یہ بتا کہ جب شہر میں میرا جی چاہے گا ڈھولا گانے کو تو میں کس کے ساتھ گاؤں گا۔ تُو تو وہاں نہ ہو گی پھر؟"
اور شمو نے اماں بی سے سنی ہوئی کہانیوں کے مطابق شرارت سے سر کا ایک بال توڑا اور دبدبے سے کہا "لو یہ ہمارا بال۔ جب ہماری ضرورت پڑے اس بال کو دھواں دینا' ہم فوراً پہنچ جائیں گے۔"
شمو اور شہباز دیر تک ہنستے رہے تھے اور شہباز نے بال کو مٹھی میں لے کر کہا تھا "بہت اچھا لال پری! شہزادہ گلرخ وہی کرے گا جو تو نے بتایا۔"

"ٹھیک ہے" —— شمو نے ماضی کے خیابانوں میں جی کھول کر گھوم لینے کے بعد سوچا —— لیکن وہ بچپن کے دن تھے اور اب سوچنے سمجھنے پوچھنے کا زمانہ ہے۔ ساری عمر کا معاملہ ہے۔ پل بھر کی بات ہوتی تو جان ہلکان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ شہباز ان دنوں بڑا البیلا چھوکرا تھا۔ چچا اللہ یار خان ان دنوں زندہ تھے۔ ان کے صحن میں گایوں اور بھینسوں کا ایک انبوہ جمع رہتا تھا۔ دروازے پر میراسیوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ آ جا لگی رہتی تھی۔ مگر چچا کے مرنے کے بعد جب لالاؤں نے لال پوتھیوں کے قفل مروڑے تو سب کچھ قرق ہوتا چلا گیا اور میاں شہباز ٹٹروں ٹوں ہو کر رہ گئے۔ مارے فاقوں کے بھاگے تو فوج میں جا کر دم لیا۔ وہاں نہ جانے کون سے درخت کے پتے کھائے کہ سوکھ کر کانٹا

ہوئے جا رہے ہیں۔ مگر بیاہ کا شوق نہیں مٹتا۔ اور بیاہ بھی کس سے؟ شمو سے جس کے تلوے میں ایک کانٹا نہیں چبھا اور جس کا نام لیتے ہی نوجوانوں کے پتّے پانی ہو جاتے ہیں۔ شمو نے مردوں کی ہٹ کے متعلق عورتوں سے جو کچھ سنا تھا وہ اب حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو رہا تھا——— "مرد عورت کی پروا نہیں کرتا' مرد خود غرض ہوتا ہے' مرد طوطا چشم ہے' مرد ظالم ہے' مرد بے وفا ہے"——— شمو کے اعصاب میں مارے غصے کے اینٹھن سی ہونے لگتی۔ وہ ہر روز شہباز کے کردار میں نت نئے خیالی اضافے کرتی' یہاں تک کہ شہباز اس کے خوابوں کا بھوت بن گیا۔ سوکھا سڑا' دبلا مارا' ہلدی کا پتلا' آنکھوں میں انگارے' سانسوں میں دھواں' لمبے لمبے بے ڈھنگے ڈگ بھرتا ہوا———
"ہائے"! وہ تڑپ کر چیخ اٹھی اور اس کی آواز لمبی لمبی کراہیں بن کر دیر تک اس کے سنہری بُندوں سے چمٹ کر سرسراتی رہتی۔

بھادوں کے شروع میں جب برکھا نے پہاڑوں کو دھو ڈالا اور کھیتوں میں آئینوں کی چادریں جما دیں تو شمو کی اداسی ایک ناقابل بیان کرب کی صورت اختیار کر گئی۔ اسے اپنے والدین سے نفرت سی محسوس ہونے لگی۔ سہیلیوں کو بے طرح جھڑک کر تنہا رہ گئی۔ لیکن اس کی تنہائیاں شہباز کے ڈراؤنے پیکر کی پرچھائیوں اور گاؤں کے دوسرے جوانوں کی پھبتیوں سے لبریز تھیں اور جس روز اسے معلوم ہوا کہ شہباز عصر کے بعد پلنگ پر بیٹھے بیٹھے بیہوش ہو گیا ہے تو اس نے تہیہ کر لیا کہ آج راجو یا امی کے سامنے اپنے سینے کا سارا ابال اگل دے اور اگر کوئی بھی اس کی دستگیری کو نہ پہنچے تو چھت پر چڑھ کر چیخنے اور پیٹنے اور بال نوچنے لگے اور بے رحم والدین کی عاقبت نا اندیشی کا ساری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹتی' بھڑکتے تنور میں گر کر جل مرے یا کسی گگر پر سے نیچے اندھیری کھاڑی میں کود جائے۔

گھر میں شہباز کی بیہوشی کا تذکرہ چل رہا تھا کہ بڑے دروازے پر سنار

نے "میاؤں" کی۔ ابا شہباز کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ امی کیچڑ میں جوتے چٹخاتی دوڑیں۔ ڈیوڑھی میں کھسر پھسر کر کے بھاگم بھاگ پلٹیں۔ آہنی بکس چنگھاڑا اور ایک لمبی ڈکار لے کر خاموش ہو گیا۔ بادل زور سے گرجا اور بھیگا ہوا سنار مارے ڈر کے ڈیوڑھی سے اچھل کر صحن میں آ رہا۔ امی نے اسے "لا الٰہ الا اللہ" پڑھنے کو کہا اور شمو نے ماتھے پر لٹکتے اور ڈستے ہوئے جھومر کو جھٹک کر سر کے پیچھے ڈال لیا۔ تکیے میں سر چھپا کر رونے لگی اور بادل کی گرج ایک گڑگڑاتا ہوا تسلسل اختیار کرتی سارے آسمان پر دیر تک ناچتی رہی۔

کسی نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھ دیا۔ ہراساں راجو منہ کھولے آنکھیں پھاڑے پلنگ کی پٹی پر بیٹھی تھی۔ بے اختیار ہو کر شمو اس سے لپٹ گئی۔ ضبط کے باوجود سسکیوں اور ہچکیوں کی آوازوں سے کمرہ چھلکنے لگا۔ اس کی امی نے فضا میں بارش کے علاوہ شاید کسی اور نوع کی نمی محسوس کی۔ وہ شمو کے کمرے میں لپکی۔ شمو اور ساتھ ہی راجو کو روتا دیکھ کر اس نے شمو کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور خود بھی رو کر بولی "میں جانتی ہوں تو کیوں رو رہی ہے۔ میں کئی دنوں سے یہ بات جانتی ہوں مگر جان بوجھ کر تجھ سے ذکر نہ کیا کہ شاید یہ بات خود ہی تیرے خیالوں سے نکل جائے۔ میں کیا کروں میری بیٹی! تیرے ابا مجبور ہیں نا۔ انہوں نے زبان دے رکھی ہے نا اور تو جانتی ہے کہ تیرے ابا گردن کٹا دیں گے پر اپنی زبان سے نہیں پھریں گے۔ یاد ہے نا وہ شہر کے سردار کے ساتھ ان کا———"

امی کی گفتگو کے دوران میں اچانک شمو کو اس کے غرورِ نفس نے چونکا دیا۔ وہ گھر میں ایک ضدی شہزادی کی طرح پروان چڑھی تھی اور سہیلیوں میں وہ ایک غصیل ملکہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس وقت اس نے امی اور اپنی ایک ہی بچی کھچی سہیلی راجو کی بھیگی ہوئی آنکھوں کے نرغے میں اپنے آپ کو بہت ذلیل محسوس کیا۔ تڑپ کر اٹھی اور آنکھیں پونچھ کر بولی "میں نے کسی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ میں نے کسی سے بھیک نہیں مانگی اور نہ مجھے بھیک مانگنے کی ضرورت پڑی۔ مجھے تو اس خیال سے ذرا سا رونا آگیا ہے کہ یہ گھر جس میں پلی بڑھی ہوں' مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھٹ گیا ہے۔"

"کیوں چھٹ جائے گا؟" اب شمو کی ماں کا چہرہ مجسم مسکراہٹ بن گیا تھا اور راجو کے انداز سے مترشح تھا کہ اس کا جی چاہتا ہے مسکرانے کو' مگر محسوس کرتی ہے کہ یہ موقع مسکرانے کا نہیں۔ المناک سنجیدگی اور دردناک سکوت کا ہے۔

امی اپنی پہلی باتوں کے اثرات کو دور کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتی چلی گئیں اور راجو دیر تک چپ چاپ بیٹھے رہنے کے بعد اٹھتے ہوئی بولی "اچھا بہن!"

"خدا حافظ" شمو یوں بولی جیسے یہ الفاظ دیر سے اس کے لبوں پر تیر رہے تھے۔

اور حقیقت بھی یہی تھی کہ شمو کے ذہن میں ایک نیا عزم' ایک نیا ولولہ جنم لے چکا تھا اور وہ اپنے ذہن کی اس نئی تخلیق کے زیر اثر بت کی طرح چپ چاپ بیٹھی خلا میں گھور رہی تھی اور جب کمرہ خالی ہو گیا تو وہ ادھ کھلے دروازے کو مضبوطی سے بھیڑ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اپنے عزم کی بکھری ہوئی شعاعوں کو ایک مرکز پر لا کر اس نے اس نئے آفتاب سے اپنی روح کے علاوہ اپنا چہرہ بھی تپا لیا اور جب گاؤں پر نیندوں نے مکمل قبضہ کر لیا اور ابا امی کے کمرے کی جھریاں دروازے کی سیاہی میں گھل گئیں تو وہ چپکے سے باہر صحن میں آئی۔ ابا کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ "اب اچھا بھلا ہے۔ کئی بار کہہ چکا ہوں کہ ویسے ہی چکر آگیا تھا۔ ابا یاد آ گئے بیچارے کو۔ اب مزے سے سو رہا ہو گا۔ ستار "ماتھے کی دعائیں" تیار کر لایا تو کام شروع کر دینا چاہیے۔ وہ بیمار نہیں صرف اداس ہے' صرف اداس۔ بڑے دروازے کی کنڈی کو نہایت احتیاط سے

کھول کر شمو اندھیری گلیوں میں دیواروں سے لگتی ایک ایسی منزل کو روانہ ہوئی جس کا کہرا اس کے ذہنی آفتاب کی زد میں آنے کے لیے لمحہ بہ لمحہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

ٹیڑھی ترچھی گلیوں میں کئی موڑ کاٹتی وہ ایک جگہ اچانک ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے دل کی دھڑکن سے فضا بجنے لگی اور سوئے ہوئے ماحول میں جیسے بیداری کے آثار پیدا ہونے لگے۔ گھر سے نکلتے وقت جو اندھیرا کاجل کو شرماتا تھا' اب پھٹے ہوئے بادل سے جھانکتے ہوئے ان گنت تاروں کی لو سے اپنی شدت کھو بیٹھا تھا۔ ایک مرتبہ تو اس خواب آلود لو میں اس نے اپنا سایہ تک دیکھ لیا اور وہ سوچنے لگی کہ اگر کسی کو اس کے اس سفر کا علم ہو جائے' اگر کوئی دیکھ لے کہ شمو رات کو اپنے ہونے والے شوہر کے دروازے کے قریب کھڑی پائی گئی تو کیا ہو گا؟

کیا ہو گا؟ کچھ نہیں ہو گا۔ بس یہی ہو گا کہ وہ بدنام ہو جائے گی۔ ماں باپ اس سے بگڑ جائیں گے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خود شہباز اس پر شبہ کرنے لگے گا اور وہ چند روز ایک آوارہ لڑکی کی طرح بے حیائی سے ہنس کھیل کر اپنے آپ کو پھر اسی بلند مقام پر لے آئے گی جہاں سے اسے ساری دنیا ایک حقیر کھلونا دکھائی دیتی تھی۔

بڑھ کر اس نے شہباز کی حویلی کے بڑے دروازے کو چھوا' مگر وہ اندر سے بند تھا۔ ہرنی کی سی قلانچ بھر کر وہ پست دیوار پر چڑھ گئی۔ دھیرے سے لٹک کر صحن میں آئی۔ ہولے ہولے قدم اٹھاتی ایک کمرے کی طرف بڑھی جس کی جھریوں میں جیسے کسی نے سیندور چھڑک دیا تھا۔

آج شہباز بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا' ممکن ہے اس کی تیمارداری کے لیے اس وقت کوئی اس کے پاس بیٹھا ہو اور سارا کھیل چوپٹ ہو جائے۔ جھریوں میں سے جھانک کر اس نے شہباز کا پلنگ ڈھونڈنے کی کوشش

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی۔ پلنگ سامنے ہی بچھا ہوا تھا اور شہباز جاگ رہا تھا اور دروازے کے بالکل مقابل شہباز کے سرہانے ایک صندوق پر مٹی کا دیا جل رہا تھا۔

شہباز کو دیکھ کر اس کا دل ایک دھڑاکے سے اچھلا اور جیسے سارے جسم کے خون کو چوس کر خاموش ہو گیا۔ چکرا کر اس نے ٹھنڈی ہوتے ہوئے جسم کو زور زور سے ملا اور وحشت ناک تیزی سے کواڑ کوٹ ڈالے۔

شہباز دہل کر اٹھا اور خاصی کڑی آواز میں پکارا "کون ہے؟"

جواب نہ پا کر اس نے نہایت تیزی سے کواڑ کھولے۔ دیے کی سیندوری روشنی کا ایک ریلا شمو سے ٹکرایا' اور شہباز اور شمو دونوں بوکھلا گئے۔

"شمسی!" اس نے یہ لفظ یوں ادا کیا جیسے بھڑکتے شعلوں میں سے اچانک اس پر پھول برس پڑے ہوں۔

شمو کچھ دیر چپ جاپ کھڑی رہی۔ پھر اس نے پلکیں اٹھائیں اور شہباز کو دیکھا جس کے چہرے کی زردی' آہنی سفیدی میں بدل چکی تھی۔ "میں تم سے رحم کی بھیک مانگنے آئی ہوں۔" شمو کی آواز میں گھٹا گھٹا سا ترنم تھا' جیسے ستار کے ڈھیلے تاروں سے کوئی رکا رکا نغمہ نکلے——"میں نے آج تک کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا' کسی سے بھیک نہیں مانگی' مگر میں تم سے——اپنے مرحوم چچا کے بیٹے سے بھیک مانگنے آئی ہوں——اپنی زندگی کی بھیک' اپنی——اپنی امنگوں کی بھیک!"

شہباز کی نظریں شمو کے چہرے پر گڑ گئی تھیں' اور اس کے جسم سے جیسے زندگی کی آخری رمق بھی غائب ہو چکی تھی۔

"صرف تمھی مجھے یہ بھیک دے سکتے ہو شبو! ہم اکٹھے کھیلے ہیں' اکٹھے پلے بڑھے ہیں۔ تم بہت اچھے تھے اُن دنوں' مگر اب تم——

"میں سمجھ گیا" شہباز کی کھوکھلی آواز گونجی "تم مجھ سے اپنی زندگی کی

بھیک مانگنے آئی ہو' ٹھیک ہے نا؟"

شمو چپ چاپ کھڑی رہی۔

شہباز کو پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ اٹھ کر اس نے پلنگ کے نیچے سے ایک بکس کھینچا اور کہیں پاتال میں سے ایک ننھی سی ڈبیا نکال کر آگے بڑھا۔ "مجھے دکھ ہے کہ میں تمھیں وہ چیز نہ دے سکا جو تم نے مانگی' لیکن میں اپنا سارا اثاثہ تمھارے حوالے کرتا ہوں۔"

حیرت زدہ شمو نے اندھیرے میں راستہ ٹٹولتے ہوئے مسافر کے انداز سے ڈبیہ کو کھولا' گھور کر دیکھا اور پھر ڈبیہ کو دیے کے قریب لے جا کر سکتے کے سے عالم میں آ گئی۔

اس کے تنے ہوئے اعصاب میں معاً" نرم نرم خنکیاں رواں ہو گئیں۔ اس کے سنجیدہ چہرے کے جمے ہوئے خطوط میں مسکراہٹوں کی قوسیں ابھریں اور وہ بولی: "اب اسے دھواں دینے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔"

شہباز کے چہرے کی آہنی سفیدی پر دیے کی روشنی نے سیندور سا چھڑک دیا تھا۔

موت

یہ بھی کوئی زندگی ہے! ہر وقت خوف' ہراس۔ کوئی دیکھ نہ لے' کوئی پا نہ لے۔ اور جب ابدی رفاقت کا سوال سامنے آتا ہے تو کوئی راہ بجھائی نہیں دیتی۔ صرف دو حل ہیں۔ ماحول سے فرار یا زندگی سے فرار۔ پہلے فرار کا خیال آتے ہی خاندانی وقار' سماج' قانون' مذہب' غرض بے شمار پرچھائیوں کی ایک گھٹا چاروں طرف سے سمٹنے لگتی ہے' اور ذہن کے ارد گرد ایک فولادی خول ڈھال دیتی ہے۔ دوسرے فرار کے تصور میں سکون ہے' دبدبہ ہے' بقا ہے۔ کلثوم اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے عدم کی اندھیاریوں میں کوئی واضح خط تلاش کرتے ہیں' کچھ پلے نہیں پڑتا' مگر اس پابند زندگی سے فرار کا خیال ہی سکون بخش ثابت ہوتا ہے اور ہم تجویزیں سوچتے ہیں۔ زندگی کے بحر ذخار کا ساحل کہاں ملے گا۔ زہر' سولی' آگ' چٹانوں سے پٹی ہوئی گھاٹی' دندناتا ہوا انجن' چمچماتا ہوا خنجر!—— کلثوم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ میری آواز کھوکھلی ہو کر بجنے لگتی ہے۔ ہم پھر ابتدا کو پلٹتے ہیں مگر انتہا سے مفر نہیں' اور ہماری انتہا زندگی سے فرار ہے۔ کلثوم کا راستہ تکتے تکتے کواڑ کی تختیاں دھواں دھار بدلیوں میں تبدیل ہو گئیں اور دیوار پر لٹکی ہوئی تصویریں اڑنے لگیں اور روشندان میں چمکتا ہوا ستارا کمرے میں گھس آنے کے لیے تڑپنے لگا۔ خود میرا وجود بہت سے حصوں میں بٹ کر پرواز پر تل گیا۔ ڈولنے لگا' ڈوبنے لگا' اور میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے تنگ آ کر آنکھیں بند کر لیں' اور اپنے ذہن کو نئے نئے سیال خیال سے کھنگال کر صاف کر لیا۔

مگر میری اداس خیال آرائیوں کے اثراتِ مابعد ابھی تک میری آنکھوں میں نمی بن کر تیر رہے تھے' اور میرے پپڑائے ہونٹوں پر ہنوز ایک عجیب قسم کی تلخی کا احساس باقی تھا کہ اچانک میرا کمرہ ریشمی ملبوس کی سرسراہٹوں سے چھلکنے لگا' اور عود حنا اور کافور کی ملی جلی خوشبو سے' گھٹی گھٹی فضا مہکنے لگی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو میرے بوسیدہ صوفے کے قریب ایک عورت کھڑی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک سیاہ ریشم میں لپٹی ہوئی تھی' اور اس کے دراز فرغل کے کناروں نے رقاصاؤں کے غراروں کی طرح کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پراسرار معنی خیز شکنوں کا حاشیہ بن دیا تھا۔ عورت کی سیاہ' موٹی اور سوچتی ہوئی آنکھوں میں بلا کی گہرائیاں تھیں۔ اس کے ہونٹ نہایت سنجیدگی اور علو ہمتی سے بھنچے ہوئے تھے' لیکن ان کے گہرے گلابی خموں کے سکون میں ایک مستقل لرزش کا احساس ہوتا تھا۔ اس کا چہرہ سیپی کی طرح سفید اور بیضوی تھا' اور وہ پلکیں جھپکائے بغیر جیسے ایک اٹل عزم کے زیر اثر مجھے گھورے جا رہی تھی۔"

"کلثوم؟" میں نے خلا میں تیر چھوڑا۔

اس نے ایک ملکوتی وقار سے نفی میں سر ہلایا۔

"بیٹھ جاؤ" ذہن کی تمام راہیں مسدود پا کر میں نے کچھ کہنے کی بجائے محض بول دینا مناسب سمجھا۔

وہ فرغل کو سمیٹ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ مگر اس کے بیٹھتے ہی کسی چیز کے چٹخنے کی آواز آئی۔ میں نے نادم ہو کر کہا۔ "کوئی اسپرنگ ٹوٹا ہو گا۔ میرا صوفہ نیلام گھر سے آیا ہے۔"

اس نے اپنا سفید بازو باہر نکال کر سینے پر سے چادر کھسکائی۔ اس نے

انسانی کھوپڑیوں کا ہار پہن رکھا تھا' اور ایک ہاتھ میں انسانی بازو کی ہڈی عجیب خسروانہ تمکنت سے تھام رکھی تھی۔

"تم کون ہو؟" میں اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتے مارتے چور ہو چکا تھا۔

"میں مَوت ہوں" وہ بولی۔ اور اس کی آواز اڑتی ہوئی سنپولیوں کی طرح کمرے میں خمیدہ خطوط کی جالیاں کاڑھنے لگی۔ "میں موت ہوں اور میں تمھاری روز روز کی یاد سے تنگ آکر تم سے یہ پوچھنے آئی ہوں کہ تم مجھے قبل از وقت ہی اتنی شدت اور اتنے تواتر سے کیوں یاد کرتے ہو؟"

"مجھے تم سے محبت ہے۔" میں نے اطمینان کی ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا "میں نے زندگی کے ہاتھوں بہت دکھ اٹھائے ہیں۔"

اس کے انداز نشست و نظر سے واضح تھا کہ وہ ان دکھوں کی تفصیل سننے کے لیے تیار ہے۔ میں نے کہا: "میرا بچپن کا زمانہ روتے بسورتے' پھٹے پرانے چیتھڑے پہنتے' ٹوٹی ہوئی سلیٹوں اور چٹخی ہوئی تختیوں پر لکھتے اور ماں سے ایک پیسہ —— صرف ایک پیسہ حاصل کرنے کی ضد میں گذرا۔ بچپن کی کچی عمر سے نکل کر جب میں عنفوان شباب کی چکاچوند میں آیا اور میری بصارت اور بصیرت نے نئی نئی دنیائیں اور ان دنیاؤں کے اپنی مرضی کے ڈھالے ہوئے قوانین اور ان قوانین کی زد میں سے بچتے ہوئے بلند مقاموں اور ان کی زد میں آکر مٹنے والے خاک نشینوں کو دیکھا تو میں نے بغاوت کی ٹھانی۔ تم جانتی ہوگی کہ دنیا کے سب بڑے بڑے باغیوں نے اول اول اسی سن میں معاشرت' معیشت اور سیاست کے مقررہ ڈھروں پر تیوری چڑھائی۔ سو میری یہ بغاوت اختیاری عمل نہ تھا۔ مجھے محلوں کی بلند دیواروں اور معلا چھتوں سے بے اختیار نفرت ہوگئی۔ میں ویران مسجدوں کے صحن اور سنسان سڑکوں کی پٹڑیوں پر سویا۔ ایک زمیندار کے آٹھ سو من گندم کے مقابلے میں میں نے اپنے چار

منوں کو کھلیان پر ہی خیرات میں دے دینا بہتر سمجھا۔ میں نے ریشم و دیبا کے ضرورت سے زیادہ ملبوسات سے جل کر کھدر کے کپڑے پہنے' اور گونجتے گرجتے بازاروں میں ایک ایسے انسان کی حیثیت سے ٹہلتا پھرا جو اس دولت اور اس کی تمام ہنگامہ سامانیوں سے قطعی بے پروا ہے۔ لیکن میرے شعور کے کسی دور دراز گوشے میں آہستہ آہستہ احساس کمتری نے جڑ پکڑنا شروع کی اور میری زندگی' جو پہلے ہی تلخ تھی' اب ایک مستقل تلخی بن کر رہ گئی۔"

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔" موت نے کھوپڑیوں کے ہار کو کھڑکھڑاتے ہوئے پہلو بدلا۔ وہ مجھ سے شاید اتنی تفصیل کی متوقع نہ تھی۔ "میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے' اور آج کل میں بہت مصروف رہتی ہوں۔"

"تمھیں کہاں جانا ہے؟"

"مجھے زمین کے ایک سرے سے دوسرے تک پرواز کرنا پڑتی ہے۔" موت اسی سنجیدگی سے بولی جس نے اس کے لبوں کے کناروں پر قوسی احاطہ سا بنا رکھا تھا۔ "مجھے یورپ اور مشرق وسطیٰ کے جنگی محاذوں پر گھومنا تھا' مگر وہاں میں نے اپنے اَن گنت کارندے چھوڑ رکھے ہیں۔ میں نے اپنے فرائض کی بجاآوری کے لیے تمھارے ہندوستان کے خطۂ بنگال کو چن رکھا ہے' جہاں تمھارا ٹیگور پیدا ہوا تھا۔ جہاں تمھارا نذر الاسلام زندہ ہے۔ اور کہتے ہیں اسی سرزمین میں نغمے نے جنم لیا اور یہاں کی عورتوں کی آنکھوں اور بالوں کی مثال دنیا بھر میں نہیں ملتی۔ یہاں کے میدانوں میں خوشبوئیں اور جنگلوں میں وسعتیں اور پربتوں میں رعنائیاں ہیں۔ اگرچہ مجھے تمھارے ہندوستان سے گزشتہ دو تین صدیوں سے تعلق خاطر رہا ہے لیکن کچھ عرصے سے مجھے بنگال نے مسحور کر لیا ہے۔ وہیں سے اڑوس پڑوس کی بھی نگرانی کروں گی۔ مجھے بہار کے خطے پر کچھ دیر منڈلانا ہے اور چند لمحے آسام اور برما کے جنگلوں میں بھی گھومنا ہے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"تم بہت آوارہ واقع ہوئی ہو۔" میں نے محبت بھری شکایت کی۔

"موت کی آوارگی ہی اس کی زندگی ہے۔ موت بیکراں ہے اور بیکرانیاں سکون سے ناآشنا ہوتی ہیں۔ موت ایک وحدت ہے اور یہ بیکرانیاں تمہارے تصور کی محدود اڑانوں سے بالاتر ہیں" ——— وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی جیسے بے جانے بوجھے اس نے کوئی بہت بڑا راز فاش کر دیا ہے۔ پھر کہنی کو صوفے کے بازو پر ٹیک کر بولی "تم اپنے احساس کمتری کا ذکر کر رہے تھے۔ میں تمہاری مدتوں کی محبوب ہوں' اس لیے تمہاری سرگزشت سنوں گی۔ مگر ٹیگور اور نذرالاسلام کے وطن میں اُن جھونپڑیوں کا بھی خیال رکھو جہاں ریڑھ کی ہڈی سے چپکے ہوئے پیٹ اور کانوں سے اوپر اٹھی ہوئی شانوں کی ہڈیاں کھنچ کھنچ کر چیخ چیخ کر میری دستگیری کی دہائی دے رہی ہیں۔ اجمال سے کام لو' اجمال گفتگو کا حسن ہے۔"

"تمھیں بھی حسن سے مَس ہے؟" میں نے طنزاً" پوچھا۔

"موت حسن نہیں تو اور کیا ہے۔ موت حسن مکمل کی ایک ادا ہے' اس لیے حسین ہے۔"

"اور زندگی؟" ——— مگر اچانک میں سنبھل بیٹھا۔ موت کے چہرے پر سنجیدگی کا ہالا جیسے بھڑکتے اور چکراتے ہوئے شعلوں میں بدلنے والا تھا۔ میں نے فوراً" موضوع بدلا: "ہاں میں کہہ رہا تھا کہ میری زندگی جو پہلے ہی تلخ تھی' اب ایک مستقل تلخی بن کر رہ گئی۔ میرا احساس کمتری دراصل ذلتوں اور رسوائیوں کے ایک نئے اور دراز سلسلے کی بنیاد ثابت ہوا۔ اور جب میں نے محبت کی' وہ محبت جو شاعروں اور مصوروں کے شاہکاروں کے باعث میرے ذہن پر سنہری غبار بن کر چھائی رہتی تھی' جب میرے شعور میں جاگی اور میں اپنے ماحول' اپنے سماج اور اپنی قوتوں سے' بے پروا ہو کر اس محبت کے زیر اثر مارا مارا پھرنے لگا تو اس احساس کمتری نے تصور کی وہ جنبشیں بھی مجھ سے چھین

لیں' جو مشاہدے سے نہ سہی' مطالعے کے دم سے میرے احساسات کی امانتیں تھیں۔ محبت کی تلخ کامیوں سے دل بجھا مگر پیٹ کی آگ بھڑک اٹھی' اور میں نے روٹی کمانے کی خاطر احساس کمتری کے عقب میں دبکے ہوئے اس جذبۂ خودداری' اس غرورِ نفس' گھٹاٹوپ اندھیرے میں اس ننھی سی چمکتی ہوئی شمع کو بھی فنا کر ڈالا' جس نے مجھے کئی مرتبہ گرنے اور گر کر پڑے رہنے سے بچایا تھا۔ میں غلامی در غلامی کے بھنور میں گھر گیا' مگر پیٹ کی آگ تیز تر ہوتی گئی۔ ایک الاؤ سا بھڑک اٹھا۔ آتش و دود کا ایک مینار سا بلند ہوا اور میں اس خود ساختہ جہنم میں جل کر بھسم ہو گیا۔ مگر ابھی تک میں اپنے جسم' اپنی روح' اپنے مزاج کو ایک بھوبھل میں پڑا ہوا محسوس کرتا تھا۔ یہ بھوبھل نہ بھڑکتا تھا' نہ بجھ چکا تھا۔ ایک چنگاری بجھتے بجھتے دوسری چنگاری کو روشن کر جاتی تھی اور رواں دواں' رقصاں و جولاں چنگاریوں کی یہ لہر اَن مٹ تھی' اٹوٹ تھی کہ اچانک ———"

میں رک گیا' موت کی سوچتی ہوئی آنکھوں کو لانبی خمیدہ پلکوں بھرے پپوٹوں نے بہت حد تک ڈھانپ لیا تھا۔ پتلیوں کی حرف زریں قوسیں نمایاں تھیں' جن سے میں نے شعاعوں کے تار چھوٹتے دیکھے اور میں نے گھبرا کر پوچھا "تم کس سوچ میں ہو؟"

میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے' اس کے پپوٹے اوپر اٹھ گئے "میرے نائب روحوں کے انبار سمیٹ سمیٹ کر تھک چکے ہیں۔"

"تمھیں نیند آ گئی تھی۔"

"موت کو نیند نہیں آتی۔ نیند ایک کمزوری ہے۔ مجھے نیند آ جائے تو کُرّے ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں' ستارے متصادم ہو جائیں' چاند زمین پر گر پڑے اور سورج زمین کے سینے میں دھنس جائے اور خلا میں واویلا مچ جائے' اور عناصر سر پیٹتے پھریں۔"

"تم خدا نہیں ہو۔"

"میں خدائی میں توازن رکھتی ہوں۔ ایک پھول کے رنگ و بو کو صرف اس لیے نچوڑتی ہوں کہ کونپل سے نئی کلی پھوٹے۔ میرے خدا کا حکم ہے کہ دنیا پرانی نہ ہونے پائے۔ جدید و قدیم میں ایک توازن قائم رہے اور توازن حسن ہے' اور میں حسین ہوں۔ میں حسن مجسم کی ایک ادا ہوں۔"

"اور میں انسان ہوں۔" میں نے تنک کر کہا "میں مسجود ملائک ہوں۔ میں خلیفۃ اللہ ہوں۔ میں اشرف المخلوقات ہوں۔ میں صناع مطلق کی اعلیٰ ترین صنعت ہوں۔"

"اور تم میرے محتاج ہو' اور تمھاری احتیاج ہی مجھے آج یہاں کھینچ لائی ہے۔"

شرمندہ ہو کر میں نے سر جھکا لیا۔ موت نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو تم اپنے آپ کو ایک بھوبھل میں پڑا ہوا محسوس کر رہے تھے۔"

"ہاں" میں نے ٹوٹے ہوئے تار کو پکڑا۔ "اس عالم میں کہ میرے چار طرف چنگاریوں کا قیامت خیز تیزی سے چکر کاٹتا ہوا ایک دائرہ تن گیا' میں نے گھبرا کر اس دائرے میں کوئی رخنہ ڈھونڈنا چاہا' کیونکہ اس دائرے میں مجھے تم نظر آئی تھیں' اور اُن دنوں تم میری نیندوں کی بُجھتی تھیں' بالآخر یہ رخنہ مجھے مل گیا اور میں نے باہر جا کر اپنی امنگوں کے ملبے میں سے کام کی چیزیں چننا شروع کیں۔ محبت کے کھنڈر مجھے ماضی کی باقیات میں سب سے بھلے معلوم ہوئے اور میں نے محسوس کیا کہ میں ابھی جوان ہوں۔ یہ جذباتی مردنی دراصل میری دوں ہمتی کا نتیجہ تھی ورنہ یہ راہ اتنی مختصر نہیں اور نہ اتنی سنسان ہے کہ انسان بڑھتے ہی پلٹ جائے۔ میرے خیالات پر ایک سرشار کن نوعیت کا عالم چھا گیا اور اسی عالم میں میں نے پڑوس میں کلثوم کو دیکھا اور زندگی جو اب تک بالکل بے مقصد نظر آتی تھی' بڑے بڑے بلند مقاصد کا ایک ہجوم معلوم ہونے

لگی۔ میرے سارے ماضی پر کلثوم کی مسکراہٹوں نے سنہری اور روپہلی کُہرے چھڑک دیئے' اور جب میں نے مستقبل کی سنسناتی ہوئی اندھیاریوں کو اس کے وجود کی کرنوں سے جگمگانا چاہا' ایک بلند دیوار کھڑی ہو گئی۔ یہ دیوار خاندانی وقار' سماج' قانون اور مذہب کے خشت و سنگ سے اٹھائی گئی تھی۔ ہم دونوں نے اس دیوار سے ٹکرانے اور اس میں شگاف ڈال کر آگے نکل جانے کی کئی بار ٹھانی' مگر یہاں کے ریزے ریزے میں ٹکٹکی باندھے ہوئے آنکھ کی پتلی ہماری ہر حرکت پر ہمارے ساتھ گردش کرتی تھی۔ تھک ہار کر ہم نے اپنے وجود ہی سے نکل بھاگنا چاہا کہ ہماری روحیں تو ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں مگر تم تک رسائی کے تمام سامان ڈراؤنے اور گھناؤنے تھے۔ اور ہمارے احساسات میں محبت نے ایسی بالیدگی پیدا کر دی تھی کہ ہم بھدی موت نہیں مرنا چاہتے تھے۔ ہمیں اپنے انجام میں بھی حسن کی تلاش تھی۔

موت نے پہلو بدلا "موت سولی کا تختہ یا زہر کی پڑیا نہیں۔"

"یہی راز سمجھنے کے لیے میں نے تجھے پکارا" میں اب موت سے مسحور ہو چکا تھا۔ "یہ راز میری سمجھ میں نہیں آئے گا' اور جب تک اے میری سیاہ پوش محبوبہ! تو مجھے اپنے دامن میں پناہ نہیں دے لیتی۔ اسی لیے میں نے رات کی اندھی وسعتوں اور دن کی منہ پھاڑتی ہوئی بے کرانیوں میں تجھے دہائیں دیں۔ میں نے تجھے ویران قلعوں کے شکستہ برجوں پر سے آواز دی۔ میں نے ٹوٹی ہوئی قبروں کے خوفناک شگافوں کے قریب جھک کر تجھے پکارا۔ میں طاعون زدہ بستیوں کی ہولناک خاموشیوں میں تیری بارگاہ کی راہ ٹٹولتا پھرا۔ اور آج جب کہ میں زندگی اور موت دونوں سے مایوس ہو چکا تھا' تم خود ہی میرے پاس چلی آئیں۔"

"تم غلط راہوں اور غلط مقامات پر بھٹکتے پھرے۔" موت نے کہا اور پھریوں بولی جیسے وہ سارے قصے کو ختم کر دینے پر تلی ہوئی ہے۔ "تم کیا چاہتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہو؟"۔۔۔۔ اس کے چہرے کی مرمریں پاکیزگی گلابی جھنجلاہٹ میں بدل گئی تھی۔ وہ ایک کھوپڑی کو انگلی کے ناخن سے کھرچ رہی تھی' اور یہ شغل کچھ اس انداز سے جاری تھا جیسے وہ ذہن میں اٹھتے ہوئے کسی طوفان کا رخ موڑنے کی کوشش میں مصروف ہے اور یہ کوشش کامیاب نہیں ثابت ہو رہی۔

"میں تمھیں چاہتا ہوں" میں نے بے اختیارانہ کہا "میں تمھارے اس ریشمی فرغل کی نرم لہروں میں لپٹ کر ہمیشہ کے لیے زندگی سے بھاگ جانا چاہتا ہوں' کیونکہ زندگی وحشی ہے' خونخوار ہے' اس کے جبڑوں میں لہو ہے' اور پیپ ہے' اور کچے گوشت کی دھجیاں ہیں۔ تم رحم دل ہو' غریب پرور ہو' تمھارے لبوں کی محرابوں میں سکون ہے اور سرور ہے اور نیندیں ہیں۔"

"تم ابھی کچھ مدت تک میری آغوش کی جنت سے محروم رہو گے۔"

موت نے لاپروائی سے کہا "تم نے ابھی اس زندگی کا پورا مزہ نہیں چکھا جو تمھیں دربار خداوندی سے خیرات میں ملی تھی۔ تم نے ابھی تک میرے قرب کی اہلیت حاصل نہیں کی۔ میں عموماً پختہ کاروں سے محبت کرتی ہوں"

"مگر تم تو بچوں اور نوجوانوں پر خاص طور سے مہربان ہو۔" میں نے ہندوستان کی شرح اموات کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے" اس نے ہاتھ میں تھامی ہوئی ہڈی سے ایک کھوپڑی کو یونہی شغلاً بجا کر کہا "کہ تم نے پختگی کا مطلب نہیں سمجھا۔ میرا معیار بہت بلند اور بالکل الگ ہے۔ میں مستقبل کی بھی اندازہ شناس ہوں' اور کبھی کبھی مجھے کسی انسان میں مستقبل کی پختگی اس درجہ مسحور کر لیتی ہے کہ میں اس ناپختگی سے بے پروا ہو کر اسے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ مگر یہ وقت بحث کا نہیں' آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

اس نے وہی سوال اور میں نے وہی جواب دہرایا "میں تمھیں چاہتا ہوں۔"

"انسانوں کی اکثریت مجھے چاہتی ہے" اس کی مرمریں گردن کا تناؤ اچانک ایک عجیب حسین مگر مہیب صورت اختیار کر گیا۔ "چاہت میں کوئی امتیاز ہونا چاہئے اور مجھے تمھاری چاہت کے خلوص پر اعتماد ہے۔ ابھی کچھ مدت تک زندگی سے گھل مل جانے کی کوشش کرو۔ جب میرا جی چاہا تو میں تمھارے بلاوے کا انتظار نہیں کروں گی۔ اور اب کہ میں اپنے بے شمار فرائض کو محض تمھاری چاہت کے خلوص سے متاثر ہو کر اپنے نائبوں کے حوالے کر آئی ہوں' تمھاری کوئی بھی خواہش پوری کرنا چاہتی ہوں۔ مرنے کے علاوہ تمھاری اور کیا خواہش ہے؟۔۔۔۔ ایسی خواہش جو زندگی سے ورے کی دنیا سے متعلق ہو۔"

سوچنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ ذہن کے گہرے پانیوں میں اچانک ایک بھنور سا پیدا ہوا' جیسے کوئی سیپی تہہ سے اچھال دی گئی ہو' اور پانی کو چیرتی چکراتی سطح کی طرف ابھر رہی ہو۔ "میں اپنے مرحوم دوست اجمل کو ایک بار دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے انتہائی جرأت سے کہا۔

ہوا کے ایک طرار جھونکے کی سی آواز آئی۔ فضا گھٹنے لگی جیسے کمرے کی چاروں دیواریں سمٹی آ رہی ہوں۔ میں نے گھبرا کر صوفے کی طرف دیکھا۔ اب وہاں موت کی جگہ اجمل بیٹھا تھا' جس نے اپنی چند روزہ محبوبہ کے کھو جانے کے غم میں زہر فروش کے سرخ نشانات والے تمام ڈبوں سے الگ الگ پڑیاں خریدی تھی اور ہر زہر کو یوں نگلتا چلا گیا تھا' جیسے زندگی نے اسے کبھی کوئی خوشی نہیں دی۔ اس کے چہرے پر انتہا درجے کی اداسی تھی اور وہ میری طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے اسے میری حالت پر بہت رحم آ رہا ہے' اور وہ میرے بلاوے سے کچھ اتنا خوش نہیں ہے جیسے اسے ایک اٹل مجبوری یہاں کھینچ لائی ہے۔

"خوش آمدید اجمل" میں نے مسکرا کر کہا۔ اٹھ کر آگے بڑھا تو صوفہ

اتنا ہی پرے ہٹ گیا اور جب میں حیران ہو کر پلٹا تو صوفہ اپنے اصلی مقام پر آ گیا۔

"جیتے رہو میرے دوست! اس کی سنجیدگی آسیبی معلوم ہوتی تھی۔

" تمھارے چہرے سے میں نے تمھارا سوال پڑھ لیا ہے میرے ساتھی! وجود "حقیقت" ہے اور عدم' جذبات کا ایک ایسا فریب جس کا راز زندگی میں نہیں کھلتا۔ میں زندگی سے اکتا کر موت کی طرف بھاگا تھا۔ اب موت کے بعد کی حالت سے اکتا کر زندگی کی طرف آنا چاہتا ہوں مگر بے بس ہوں۔ موت نے مجھے جو زندگی بخشی ہے' اس میں بقا ہے' مگر وہ نہیں جس کی خاطر میں زمان ومکان کی پابندیوں سے بھاگ نکلا۔ وہ چہرہ نہیں جو پھولوں سے ڈھکے ہوئے طلائی طشت سے مشابہ تھا۔ وہ آنکھیں نہیں جن کی ہر جھپکی میں وقت کی ایک صدی بیت جاتی تھی۔ وہ ہونٹ نہیں جن کے لمس میں مجھے محسوس ہوا کہ زندگی محض جمود نہیں۔ یہ ایک دہکتا ہوا سرور اور بھبکتا ہوا نشہ ہے' کچھ بھی تو نہیں ملا مجھے۔"

"عجیب بات ہے!" میں اپنے تصور کے خیابانوں کو ایک دم نہیں جلانا چاہتا تھا۔ "مگر دیکھو' اس خیال کو بھلانے کے لیے اپنے ماحول کی حسین خصوصیتوں کا مطالعہ کرو۔" میں نے دنیاوی مشورہ دیا۔

"میں نے کوشش کی ہے" اس کی آواز زیروبم سے بے نیاز تھی۔

"کوشش کی ہے کہ اپنے ماحول میں ڈوب جاؤں۔ مگر یہاں کی ہر چیز پر منجمد سنجیدگی کی جھلی منڈھی ہوئی ہے۔ فرشتے ہیں مگر انھیں ذکروفکر سے فرصت نہیں۔ حوریں ہیں جو مسکراتی ہیں تو جیسے برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں پر سورج کی شعاعیں پڑ رہی ہیں۔ باتیں کرتی ہیں تو جیسے اندھا کر دینے والی کہر میں تیز ہوائیں سیٹیاں بجاتی ہیں۔ گاتی ہیں تو جیسے ہمالہ پر سے ہولے ہولے گلیشیر سرک رہے ہیں۔ میں نے انھیں چھو کر بھی دیکھا ہے۔ میں نے زندگی میں

وینس کے بت کے عکس کو بھی چھوا تھا' مگر اس کے عکس کے مس میں بھی گرمی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ انسانی جذبے کی تخلیق تھا۔ اور حور ـــــ وہ یخ بستہ پیکرِ جمال' محض ایک کھلونا ہے' اور کھلونوں سے صرف بچے ہی بہل سکتے ہیں۔ یہاں میں نے ان گنت بوڑھے بوڑھے بچے دیکھے' جو اپنی تمام پرہیزگاریوں اور شب زندہ داریوں کا اجر ایک حور کے دیدارِ مسلسل میں پاتے ہیں اور خوش ہیں' اور مطمئن ہیں اور میں بے قرار ہوں۔ میں عدم کے وسیع گلشنوں میں بھٹک بھٹک کر نڈھال ہو چکا ہوں مگر مجھے کہیں کوئی نخلستان میسر نہیں آیا۔ یہاں جنتیں ہیں' جنگل نہیں۔ یہاں لالہ زار ہیں' ریگزار نہیں۔ یہاں روحیں ہیں اور مجھے روحوں سے کوئی لگاؤ نہیں۔ مجھے گوشت پوست کے انسان چاہئیں اور یہاں شفاف پرچھائیوں کے سوا اور کچھ نہیں' کوئی نہیں' ـــــ اور کوئی ہو بھی تو کیا' جب وہ نہیں جس کے لیے میں نے زندگی سے جی بھر کر رس چوسنے کی بجائے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹ جانا افضل سمجھا۔ میں نے خدا سے دعائیں مانگی ہیں کہ نہایت معمولی وقفے ہی کے لیے سہی' وہ مجھے پھر سے زمین کی زندگی بخش دے' اور پھر ہمیشہ کے لیے نابود کر دے۔ صرف ایک مرتبہ مجھے اپنے کرّے کے طوفانوں اور خاموشیوں' اندھیروں اور اجالوں' فیروزمندیوں اور شکستوں' محبتوں اور نفرتوں میں رہنے بسنے دے۔ اور مجھے محض ایک ثانیے کے لیے اس چہرے کی ایک جھلکی دکھا دے جسے حوریں دیکھ پائیں تو خودکشی کر لیں۔"

" تمھارے مرنے کے فوراً بعد اس نے جیل کے داروغہ سے شادی کر لی تھی۔" میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے وجود کے اُس پار صوفے کی پشت نظر آنے لگی۔ میں اسے چھونے کے لیے اٹھا تو کھوپڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی' اور اجمل کی جگہ مجھے صوفے کے قریب موت کھڑی نظر آئی۔ اس کی سنجیدگی میں اطمینان کی دھاریاں سی جھلک رہی تھیں اور اس کی انگلیوں کی پوروں سے تازہ تازہ خون رس رہا تھا۔ ـــــ "یہ ـــــ یہ ـــــ!" میں

نے خون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے ایک کھوپڑی سے دھوئیں کا سا ہلکا رومال نکال کر انگلیوں کو پونچھا' اور بولی "میں برما کے جنگلوں میں چلی گئی تھی' جہاں توپ کے پہیے تلے دبے ہوئے ایک سپاہی کی ضدی روح کو اس کی نسوں سے نوچ رہی تھی کہ مجھے اجمل نے اپنے اٹھ آنے کی اطلاع دی۔"

"میں نے اسے صدمہ پہنچایا ہے' وہ اب کہاں ہے؟"

"وہ یہاں وہاں ہر جگہ ہے۔ وہ آج اور کل ہر پل میں ہے۔ وہ پھیل کر کائنات پر محیط ہو چکا ہے۔ ابلتے ہوئے پانی سے اٹھتی ہوئی بھاپ برتن سے تھوڑا سا بلند ہو کر کہاں غائب ہو جاتی ہے؟ وہ فنا نہیں ہوتی' وہ پھیل جاتی ہے' اور جب وہ پھیل جاتی ہے تو تمہاری بصارت اور بصیرت اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ میں نے بھی تمہارے سامنے سمٹے ہوئے عالم میں ایک وجود اختیار کر رکھا ہے۔ البتہ میری حِسّیں منتشر ہیں۔ ایک حِسّ تم سے متوجہ ہے مگر میری دوسری اَن گنت حِسّیں زمین و آسمان کی پہنائیوں میں رواں دواں ہیں۔"

"کیا میں خدا کو بھی دیکھ سکتا ہوں؟" میرے حوصلے بڑھ گئے۔

"اجمل نے تمھیں کیا بتایا تھا؟" موت نے پوچھا۔

"اجمل زندگی کا آرزومند تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ اگر تم کوشش کرو' اسی خلوص سے کوشش کرو' جس خلوص سے تم نے مجھے پکارا تھا' تو تم خدا کو بھی دیکھ لو گے' اور اس کے لیے تمھیں زندہ رہنا ہوگا۔ اگر تم زندگی میں اپنے مقصود کو حاصل نہ کر سکے' پھر میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ میرا کام تو محض ماحول کا انتقال ہے۔"

"اجمل۔ قانون' سماج' مذہب' غرض ہر کوئی زندگی زندگی پکارتا ہے۔ زندہ رہو' زندہ رہو' یہ کوئی نہیں بتاتا کہ کیسے زندہ رہوں۔ تم بھی کہتی ہو کہ زندہ رہوں' اور حالت یہ ہے کہ ——— دیکھو تمہاری پوروں سے ابھی تک خون بہہ رہا ہے۔"

"بہنے دو۔" اس نے بے پروائی سے کہا "جوان خون ہے۔ یہ میرے روکے سے نہیں رکے گا ——— بس اب جاتی ہوں۔"

"میرے سوالوں کا جواب؟"

"ہر سوال کا جواب سوال کے اندر غلطاں ہے۔"

"میری تشفی نہیں ہوئی۔"

"زندہ رہو۔"

اٹھ کر اس نے ایک انگڑائی لی' اور کمان سا خم کھا کر دیر تک ایک دھندلی قوس کی طرح فضا میں معلق رہی' اور جب میری جمی ہوئی نظروں نے اس قوس میں سانپ کے سے بل ڈالنا اور اسے عجیب عجیب روپ دینا شروع کیے تو میں نے تنگ آ کر پوچھا "یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

"کوئی کہاں تک تمہارے استغراق کے انجام کا انتظار کرے" مگر یہ موت کی آواز نہیں تھی۔ "جب میں یہاں آئی تو تم پر یہی حالت طاری تھی۔ جب میری آنکھ لگی تو تم اِسی عالم میں گم تھے' اور اب میری آنکھ کھلی ہے تو تم اسی طرح خلا میں گھور رہے ہو۔"

"کلثوم!" میں پکارا۔

"ہمیں نیند آئی ہے' ہم چلتے ہیں۔" کلثوم انگڑائی کا خم توڑ کر صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔

میں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنی طرف کھینچا۔ اس کے گلے میں لٹکتے ہوئے ہار کی گھونگریاں چھنکنے لگیں جیسے مل کر الاپ رہی ہوں' ——— جئیں گے' ہم جئیں گے' ہم جئیں گے۔"

تکمیل

اس نے اپنے خیالوں کے دامنوں کو کئی بار جھٹک کر ماضی کے ذروں کو الگ کرنا چاہا۔ مگر یہ عجیب ذرے تھے جو تہوں پر بچھے ہوئے ان گنت مردہ ذرات میں گھل مل جانے کے بجائے فضا میں منڈلانے لگتے تھے' اور عجیب دامن تھے جو بار بار ان ذرات کی تلاش میں پھڑپھڑا کر اپنی آغوش وا کر دیتے تھے ——"میں مصروف ہوں' میں بری طرح مصروف ہوں۔"

اس نے کانوں کے قریب گونجتے ہوئے' ماتھے سے لپٹتے ہوئے' گلے میں گھستے ہوئے' ان جیتے جاگتے' سوچتے سمجھتے ذروں کو خبردار کیا' مگر ایک بگولا سا تھا جو اس کی جھڑکی سے بوکھلا کر اس کے ذہن کے کناروں پر گھومنے لگتا تھا۔ اور پھر موقع پاتے ہی اس کے دماغ کے عین وسط میں' اس کے دل کے عین مرکز میں ایسا شدید گھماؤ پیدا کرتا تھا کہ اسے چکر آنے لگتے اور اس کی خوشدامن آس پاس بیٹھی ہوئی عورتوں کے جھرمٹ پر پل پڑتی۔ "اری کیسی جھکی پڑتی ہو میری گلزار پر جیسے گڑ کی بھیلی پر مکھیاں جمع ہوتی ہیں۔ واسطے خدا کے ہٹ کر بیٹھو —— دیکھو تو دلھن کانپ رہی ہے مارے گھبراہٹ کے۔

عورتیں سرک کر دیواروں سے لگ جاتیں اور نئے نئے گلابی کپڑوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے ڈھیر کو دیکھ کر سرگوشیاں کرتیں۔ خوشدامن دلھن کی مزاج پرسی کے لیے ہاتھوں کو کمر پر رکھے کمان کی طرح جھک جاتی اور گلزار زیوروں کی گھنگریوں کو سنبھالنے کی کوشش میں پے بہ پے نرم نرم جھنکاریں سی پیدا کر بیٹھتی۔

دلھنوں کے ریشمی گھونگھٹوں میں بھی پہلے روز جو ایک سکون سا ہوتا ہے' ایک ٹھہراؤ سا' وہ گلزار کے گھونگھٹ میں ناپید تھا۔ اور ایک گھونگھٹ ہی پر کیا موقوف تھا' اس کے سارے جسم پر پڑی ہوئی گلابی شال میں لہریں اٹھ رہی تھیں' اور شال سے پرے گلزار کے ذہن میں بھی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ خیالوں میں شکنیں پڑ رہی تھیں اور احساسات لچک رہے تھے۔ خوشدامن نے ایک مرتبہ اس پر عرق گلاب چھڑکا۔ پھر رخصت پر آئے ہوئے ایک فوجی سپاہی کے گھر سے عطر حنا لے آئی اور اسے جگہ جگہ شال پر مل دیا۔ پھر ایک نائن چھوکری کو دلھن کی ہتھیلیاں اور تلوے ملنے پر مامور کیا۔ مگر دلھن نے ہاتھ کھینچ لیے اور تلوے چھپا لیے۔ عورتیں باہر صحن میں جا بیٹھیں اور دلھن کی بے قراری کی تاویلیں کرنے لگیں۔ دلھن کے مائکے ایک میراثن چھوکری کو دوڑایا گیا کہ گلزار کو اس حالت میں کیا پلانا چاہیے اور دولھا کو کہلا بھیجا گیا کہ ریکارڈ بند کر دو' دلھن کے سر میں درد ہو رہا ہے۔

مگر گلزار کی بے قراری زیادہ گہری اور بعید از فہم تھی۔ بیاہ کے شور وغوغا نے ردعمل کی صورت میں اسے اپنے ماضی کے چپ چاپ مرجھائے ہوئے گلستانوں میں لا ڈالا تھا اور وہ ان لمحوں میں دو زندگیاں گزارنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ کنوار پنے کی دھڑکتی ہوئی شیرینی اور بیاہتا زندگی کے پہلے روز کا لہراتا ہوا بے ذائقہ پن —— ماضی اور حال میں ٹکروں پر ٹکریں ہو رہی تھیں۔ خیالات کی مٹیالی اور سفید بدلیاں آپس میں متصادم ہو کر بجلی کی سی کڑک پیدا کر کے اس کے سارے وجود کو جھنجھوڑ جاتی تھیں۔ اور باوجود کتنی ہی مایوسانہ کوششوں کے وہ اپنے آپ کو نئی زندگی کے اس دلآویز اجنبی پن سے

مانوس نہیں کر سکی تھی جو ہر عورت کی زندگی کے جھٹپٹے میں شہابِ ثاقب کی طرح نمودار ہوا کرتا ہے۔

"شادی کے دن کسی کے بھی دردِ سر کی پروا نہیں کی جاتی خالہ بی" باہر صحن میں کوئی اس کی خوش دامن سے جھگڑ رہا تھا۔ "آپ کیا جانیں کہ ہم کہاں کہاں منہ لٹکائے پھرے جب کہیں جا کر ریکارڈ جمع ہوئے۔ اور اب بیٹھک پر سارا گاؤں جمع ہے کہ آپ کی وہ لنگڑی ایلچن وہاں پہنچی مٹکتی ہوئی اور سارے گاؤں کے سامنے منہ پھاڑ کر کہہ دیا کہ "رکاٹ" بند کر دو۔ دلھن کے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"ہائے ہائے نگوڑی جنم جلی! یہ کیا کہہ دیا۔"

"تو اور کیا کہتی۔" لنگڑی میراثن کی آواز آئی۔ "بھئی مجھے ہیر پھیر کی باتیں آتیں تو آج اپنی نند تاجو کی طرح کلکتے کے بازاروں میں نہ اینڈتی پھرتی۔"

"چپ مردار!" بڑھیا نے اسے جھڑک دیا "اندر میری گلزار کے کانوں میں اس کی بھنک پڑ جائے تو کیا کہے کہ پہلے روز ہی کسبیوں، نوچیوں کا قصہ چھیڑ دیا۔ نوج دیدوں کا پانی کچھ ایسا ڈھلا ہے کہ اچھی بری بات کی تمیز ہی اٹھ گئی۔ بھرے گھر میں تاجو چڑیل کا ذکر لے بیٹھی۔ ایسا ہی شوق ہے تو کلکتے کیوں جاتی ہو، یہیں لائل پور، لاہور میں ننگی ہو بیٹھو، کئی مل جائیں گے۔"

"کیا بکواس ہو رہی ہے۔" ڈیوڑھی میں سے خسر میاں بانجھ گھٹا کی طرح گرجے۔

"یہ اللہ ماری لنگڑی——"

"بڑی ہی بیوقوف ہے۔" نوجوان نے ڈیوڑھی کو خالی دیکھ کر کہا۔ "چلو بیگاں، تم قبول کر لو سارے خطاب۔ لنگڑی سے تو بہتر ہی ہیں۔ اور خالہ بی دیکھئے اجازت دے دیجئے ورنہ بڑی سبکی ہو گی۔ دوسرے محلے کے گبھرو ٹھوکے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دے رہے ہیں اور آنکھیں میچ رہے ہیں اور بیچارے شیرن بھیا کو کسی پہلو قرار نہیں۔ کہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے تو اس میں سما جاؤں۔ بیگاں نے اسے کہیں کا نہ رکھا۔"

"اللہ اللہ یہ دماغ تمہارے۔" بڑھیا کی آواز تیز ہو گئی۔ "میں کہتی ہوں اندر دلھن پھڑکتی رہے اور تم اپنی ذرا سی سبکی کو لیے بیٹھے رہو۔ پر دیکھو اگر آسمان ہی سے حکم آیا ہے کہ ریکارڈ ضرور بجیں تو بجاؤ، مگر ذرا ہولے ہولے۔"

نوجوان ہنستا دھپ دھپ پاؤں پٹختا چلا گیا۔ بڑھیا پھر بیگاں کے پیچھے پڑ گئی۔ عمر گزار دی بھاڑ جھونکتے پر یہ پتہ نہ چلا تجھے کہ بیر کی ناف کہاں ہوتی ہے۔ چل ہٹ مردود! اب ادھر بیٹھک کی طرف نہ جائیو، ورنہ میرے بچے پر قہقہے پڑیں گے۔"

"کون ہوتا ہے میرے راجے پر قہقہے لگانے والا۔" بیگاں اب خوشامد پر اتر آئی تھی۔ "مٹھی بھر چنگاریاں چھڑک دوں گلے میں۔ وہ نگوڑا منشی حبیب ذرا منہ چڑھا ہے——سب سے پہلے اسی نے یہ آنکھیں نکال کر اور گال پھلا کر کہا تھا "جل تُو جلال تُو۔" میں تو بی! تمہاری بیٹھک کی لاج کو چپ ہو رہی، ورنہ سب جانتے ہیں اللہ رکھے پرانے راجے مہاراجوں کی اولاد ہوں——"

عورتیں ہنسنے لگیں "موئی مسخری۔" بڑھیا نے غصہ تھوک دیا اور پھر اپنے ہدف کی طرف بڑھی۔ "یہ موئے ریکارڈ برے تو نہیں لگ رہے میری رانی کو۔" اس نے گلزار کے گھٹنے سے گھٹنا ملا کر کہا۔

گلزار خاموش رہی۔ توپیں بھی دندناتیں تو اسے تصور کے ان خوابوں سے نہیں چونکا سکتی تھیں، جو قطار اندر قطار اس کے آس پاس سرکنڈوں کے جھنڈوں میں سے گزرتی ہوئی ہواؤں کی طرح سرسرا رہے تھے اور جو تہ بہ تہ اس کے گرد و پیش ابھرتے ہوئے شور پر اترتے، بیٹھتے اور جمتے جا رہے تھے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیکن لنگڑی بیگاں کے ایک ہی بول نے اسے جھنجوڑ دیا تھا۔

"اچھا تو حبیب حسبِ وعدہ اس کے بیاہ کی ساری رسموں میں شامل ہو رہا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ رات کی برات کے ساتھ وہ پہلی مرتبہ اس کے پرانے گھر میں بھی آیا ہو گا۔ بڑی عجیب بات ہے' جیسے انار کاٹا جائے اور اندر سے سنترے کی پھانکیں نکل پڑیں۔ مگر وہ سچ مچ ضرور آیا ہو گا وہاں اور بیٹھا رہا ہو گا رات بھر۔ اور جب اس کی "شہ بالی" نے شیرن کے شہ بالے کو "بیڑی گھوڑی" میں گھی سے لپے ہوئے کٹورے الٹنے کو کہا تھا اور اس کی انگلیوں کے جوڑوں پر کنگنوں سے چوٹیں لگائی تھیں تو ہنستے لوٹتے نوجوان میں حبیب بھی موجود ہو گا—— اتنی بڑی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی تھی—— اور پھر —— اور پھر صبح کو نکاح خوانی کے بعد دعائے خیر کے لیے اس نے بھی ہاتھ اٹھائے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ! میری گلزار اور شیرن کی جوڑی پھلے پھولے —— ڈولی کے آس پاس کہیں کہاروں کے قریب بھی—— ہائے ری—— اس کی ڈولی کے قریب ہی۔ اور شاید دھوپ میں اس کا سایہ بھی ڈولی پر پڑا ہو' اور شاید ڈولی پر پڑی ہوئی ریشمی شال نے پھڑپھڑا کر اس کے ہاتھ کو بھی چھوا ہو —— اور وہ بے خبر رہی۔ اب تک بے خبر رہی۔ اس وقت وہ ایک دیوار پرے بیٹھک میں بیٹھا ریکارڈ سن رہا ہے' اور لوگوں کے مذاق اڑا رہا ہے اور اس کے دل میں وہم تک نہ گزرا' اس کی آنکھ تک نہ جھپکی' اس کی نبضیں تک نہ رکیں!—— اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے کمرے کی چھت فرش بن گئی ہے' اور فرش الٹ کر چھت بن چکا ہے' اور وہ چھت اور فرش کے درمیان لڑھکتی پھر رہی ہے!—— اس نے گھبرا کر ٹانگیں پھیلا دیں۔ پازیب بج اٹھی اور نوجوان نائن اس کی پنڈلیاں دبانے لگی۔

گردن کو ایک طرف جھکا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں'—— اس نے کہا تھا "گلزار یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی لیکن ہے بالکل صاف۔

ایسی صاف جیسے اوپر آسمان پر چاند چمک رہا ہے' تمہارے چہرے پر دو آنکھیں چمک رہی ہیں۔ اتنی سی بات ہے کہ شیرن فوج میں صوبیدار ہے اور میں مدرسے میں منشی ہوں۔ اس کی تنخواہ ہر مہینے سینکڑوں تک جاتی ہے اور میں مر مٹ کر تیس سے آگے نہیں بڑھتا۔ اور غریب دولہا کبھی کسی لڑکی نے آج تک پسند نہیں کیا' غریب داماد تو ہے ہی دور کی بات۔ وہ تو ان بھکاریوں کو بھی منظور نہیں جو چراغ کی جگہ راتوں کو کٹیاؤں میں جھاڑ جھنکاڑ جلاتے ہیں اور جن کا کھانا گھر گھر کے سڑے بسے ٹکڑوں پر مشتمل ہوتا ہے—— اب رہ گئے ہم تم' تو پیاری گلزار! ہماری تمہاری کون سنتا ہے اس زمانے میں جب کہ ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں کی کوئی نہیں سنتا۔ جانتی ہو انگریز ہمارا حاکم کیوں ہے؟ تم نہیں جانتیں' بڑے بڑے عالم بھی نہیں جانتے کہ انگریز صرف اس لیے اب تک ہمارا حاکم چلا آ رہا ہے کہ وہ بہرہ ہے' وہ ہندوستانیوں کی کوئی بات نہ سن سکتا ہے' نہ سمجھ سکتا ہے' اور اس لیے—— مگر میں کہاں چلا گیا۔"

یہ باتیں میں نہیں سمجھ سکتی' لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اس کی باتوں میں صدیوں کا دکھ تھا اور اس کے چہرے پر عمروں کی نامرادیوں کی سرسوں پھول رہی تھی۔ اس کے ہونٹ نرم پتیوں کی طرح کانپ رہے تھے اور جب اس نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھا تھا تو جیسے مجھ پر اچانک کوئی چٹان ٹوٹ پڑی تھی اور اس کی انگلیوں کی پوریں جو میری گردن کو چھو رہی تھیں' کتنی بھیگی بھیگی اور پسیجی پسیجی تھیں' اور وہ کیسے دھڑک رہی تھیں!—— اور اس کی آواز بالکل خالی خالی تھی' جیسے درختوں کے کھوکھلے تنوں میں ہوا ہنکارے بھرتی ہے۔

اب لڑکیاں کھانے پینے سے فارغ ہو گئیں تھیں۔ صحن کے ایک گوشے میں ڈھولک کی دھمک دھیّا شروع ہو گئی تھی اور سب چیخ رہی تھیں:

پَٹ دی چادر اُتے اَسمانی رنگ ماہیا
تِلّی بدلی رنگلے چن دا انگ ماہیا

"سلیقے سے، سلیقے سے" بیگاں نے ہانک لگائی۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی تو پیدائش اور باتیں رنگ اور انگ کی۔ کیا اندھیر مچ رہا ہے زمانے میں۔ بیری میں بور نہیں آتا کہ لال بیر جھڑنے لگتے ہیں۔ توبہ ہے!"

"گانے دو گانے دو۔" خوشدامن نے گھڑک دیا۔ "کیا گائیں آخر یہی تو ہیں شادی کے گیت۔"

"کیا گائیں؟ جیسے بیگاں کی کوئی دکھتی رگ چھیڑ دی گئی۔ "مجھ سے پوچھتی ہو بی بی؟ بابا آدم سے لے کر اب تک جتنے گیت گائے گئے، وہ سب یاد ہیں اس لنگڑی ماری کو۔ اور بی بی اس سے پوچھنے چلی آئی کہ آخر کیا گائیں؟ میں بتاؤں کیا گائیں؟ اری سنو چھوکریو:۔

پُھل پئی چُندی یار جنھے دی بُوٹی آ[1]

اور:

کلیاں دے بند کھل گئے پھل ٹھاہ ٹھاہ ہسدے نیں[2]

اور:

آ ڈھولا اِنہاں راہاں تے
مَنجا گھت دیواں بوہڑ دی چھاں تے
سَواں تیری باہنہ تے[3]

"بس بس" بوڑھی خوشدامن کی آواز میں ماضی کی یاد نے جلترنگ کا

۱۔ میں پھول چن رہی ہوں۔ کیونکہ میرا محبوب چنے کا پودا ہے۔

۲۔ کلیوں کے بند قبا کھل گئے (کلیاں چٹکیں) اور پھول قہقہے مار کر ہنسنے لگے۔

۳۔ میرے محبوب کبھی ان راہوں پر بھی آ۔ میں تجھے ایک بڑ کی چھاؤں تلے پلنگ بچھا دوں اور پھر تیرے بازوؤں پر سر رکھ کر سو جاؤں۔

سازِ زیر و بم بھر دیا تھا۔ "انھوں نے سن لیا تو چوٹی کاٹ ڈالیں گے۔"

"چوٹی کا کیا ہے بی بی" بیگاں نے بی بی کی کمزوری بھانپ لی تھی۔ "گھر کی کھیتی ہے۔ آج کٹی تو کل دگنی بڑھے گی۔ واہ! شیرن راجہ کی شادی ہو اور کوئی کھل کر بات ہی نہ کرے؟ میں تو خود گاتی ہوں، ہاں!"

اور وہ اپنے لنگڑے پن کو بہت نمایاں کرتی ڈھولک کی طرف چلی۔ پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ گاتی ہوئی لڑکیاں جھکنے لگیں، بیگاں نے ان سے ڈھولک چھین کر گود میں رکھ لی اور ایک دلآویز تال پر ایک گیت کا پہلا بول اٹھایا:

میری ساری جوانی تیری
مینوں اک چُھی دے دے

اور بی بی نے چھاج اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا، اور وہ چھاج کو سر پر جمائے لمبے لمبے ڈگ بھرتی میم صاحب بن بیٹھی —— "ہم لہور سے آیا ہے، ہم میم لوگ ہے۔ ہم ایک بنگلہ ما نگتا، ایک کرسی کے بیچ میں خود بیٹھنا ما نگتا، دوسری کرسی کے بیچ میں ایک صاحب لوگ بیٹھنا ما نگتا، اور جب ہم تھک جانا ما نگتا تو صاحب لوگ کی گود——"

دھپ سے "بی بی" نے اس کے سر پر دوسرا چھاج دے مارا۔ قہقہے خوشی کی چیخوں میں بدل گئے، کیونکہ لنگڑی بیگاں موت کا بہانہ کیے خاک پر لیٹی ہوئی بڑبڑا رہی تھی: "ام لوگ ولایت میں دفن ہونا ما نگتا۔" قہقہوں میں ریکارڈوں کی آواز بھی دب گئی تھی۔ مگر گلزار کے ذہنی چکر پر ایک عجیب سا ریکارڈ سوار تھا کہ نہ یاد کی سوئی گھستی تھی، نہ گزری ہوئی محبت کی کوک ختم ہوتی تھی اور نہ حبیب کے گیت رکنے میں آتے تھے —— "بات یہ ہے گلزار! کہ ہم اس زمانے میں پیدا ہوئے جب روح مٹ گئی اور جسم باقی رہ گیا۔ جب خوشبو اڑ گئی اور کاغذ کے پھولوں سے گلدستے سجائے جانے لگے۔ اب تاروں کو دیکھ کر یہ کوئی نہیں کہتا کہ فرشتوں نے چاندی کے قطروں کا چھڑکاؤ کر دیا ہے یا

کسی حور کا ست لڑا ہار موتی موتی ہو کر بکھر گیا ہے۔ یا ہم سے بچھڑی ہوئی روحیں جنت کے جھروکوں میں مسکرا رہی ہیں۔ اب تو سفید لوگوں کی بڑی بڑی دوربینوں نے ان ستاروں کے اندر خوفناک غار اور آگ اگلنے والے پہاڑ اور برف کے تودے دیکھ لیے ہیں۔ اب ستارے ستارے نہیں رہے' گھورے بن چکے ہیں۔ میں نے تمہیں گلزار سمجھ کر چاہا' مگر اب زمانہ مجھ سے کہتا ہے کہ میں تمہیں صرف زمیندار کی بیٹی سمجھوں۔ بہت اچھا' یہی کر لوں گا' کرنا پڑے گا۔ اگر مجھے زندہ رہنا ہے تو بھول جانا پڑے گا کہ میری زندگی کی اندھیری رات میں —— کئی جگ بیتے —— ایک چاند نے نور اور سرور کی پھواریں برسائی تھیں —— میں دیکھ رہا ہوں میں میرے اس چاند کو افق پر سے لپکتے ہوئے کالے کالے بھدے بھدے ڈراؤنے مگر گدگدے —— سونے کے کڑوں سے مزین ہاتھ —— دور کھینچے لیے جا رہے ہیں۔ اور چاند بہت بلند ہے' اور میرے پاس اڑنے کے لیے پر نہیں۔ اور اگر پر بھی ہوں تو کیا فائدہ۔ چکور بھی تو اڑتا ہے' اور پھر اگر چکور اڑتا بھی چلا جائے تو چاند کو ڈوبنا بھی تو ہے —— اگرچہ میں نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ چاند ڈوبتا نہیں۔ یہ گھڑی ہر پل دنیا کے کسی نہ کسی حصے پر ابھر رہا ہوتا ہے۔ چاند کو ڈوبنا آتا ہی نہیں۔ جب چاند یہاں ڈوبتا ہے نا تو وہاں ابھر رہا ہوتا ہے —— اور میرا چاند یہاں ڈوبے گا نا تو وہاں ضرور ابھرے گا۔ مگر میرے لیے اس کا نیا طلوع بے فائدہ ہو گا' کیونکہ میری قسمت میں اندھیرے ہوں گے اور میں ان دیکھی راہوں پر چلتا رہوں گا اور چمگادڑیں پھڑپھڑا کر میرے سر کے قریب سے گزرتی رہیں گی' اور خراش کے درخت میرے ارد گرد ہونکتے رہیں گے اور میں چھرے کی دھار کی سی تنی ہوئی کگروں پر لڑکھڑاتا اور ——"

"گلزار بیٹا!" خوشدامن کی آواز آئی اور گلزار نے یہ محسوس کیا جیسے اس کا حبیب ایک خوفناک چوٹی پر سے نیچے کھڈوں میں لڑھکتا جا رہا ہے۔ گردن

کو ایک برقی جھٹکے سے دوسری طرف ڈال لیا اور بند پپوٹوں کے نیچے اس کی آنکھوں کے ڈھیلے بے تحاشہ بے مقصد گھومنے لگے۔

"گلزار بٹیا! آج حلوہ بھی پکا ہے اور چاول بھی' اور سویاں اور کلیجی اور وہ کیا نام ہے قورمہ۔ کیا کیا لے آؤں تیرے لیے؟"

"——"

"گلزار ——!"

"——"

"گلزار بٹیا"! یہ پکار کی بجائے سرگوشی تھی۔ "سو رہی ہے گلزار بٹیا' سونے دو' تم بھی باہر چلی آؤ نائن۔ دن بھر کی تھکی ماندی ہے' رات کو پھر جاگنا پڑے گا' سونے دو۔"

"او میری گلزار! —— میرے چاند! —— میرے ڈوبتے چاند! ——" مگر قوالی کے ریکارڈ نے واویلا مچا رکھا تھا اور باہر ڈھولک پھر بجنے لگی تھی۔ حبیب کی آواز اس ہنگامے میں دور ہوتی چلی گئی۔ اور پھر بہت دور جا کر ایک دم قریب آئی اور اس کے کانوں میں گرجتی گونجتی گھس گئی۔ "میں آؤں گا' میں ایک بار ضرور آؤں گا۔ کوئی اچھا سا موقع ملتے ہی میں کسی شام کے اندھیارے میں تمہارے پاس آؤں گا۔ ضرور آؤں گا' —— جب تم اکیلی ہو گی —— مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے"!

معاً" سینے میں اٹھتے ہوئے غباروں' گلے میں پھنسی ہوئی سانسوں اور آنکھوں میں ڈبڈباتے ہوئے آنسوؤں نے ضبط کے سارے بند توڑ ڈالے۔ خوشدامن اور نائن اور میراثن اور سہیلیاں اور ننھی لڑکیاں پازیبیں چھنکاتیں اندر گھس آئیں اور سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ میں لنگڑی بیگاں گلزار کے بے حس و حرکت جسمانی ڈھیر کو گھور کر بولی —— کوئی بات نہیں۔ نیند میں روئی ہے دلہن رانی۔ نیند میں دلہنوں کو رونا آ ہی جاتا ہے۔ ہم پر بھی بیت چکی ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

——" اور سب باہر چلی گئیں۔

"میں اکیلی ہوں۔" اس نے ایک مرتبہ پھر خالی کمرے میں ناگن کی سی پھنکار بھری۔

"میں اکیلی ہوں"—— دوسرے دن صبح کو اس نے دروازہ بھیڑ کر جاتے ہوئے دولہا کو دیکھ کر کہا۔

"میں اکیلی ہوں"—— وہ بار بار پکاری اور ایک شام کو جب دولہا میاں کسی دوست کے یہاں گاؤں میں مدعو تھے اور بوڑھا خسر سو چکا تھا' بڑھیا دیوار کے سوراخ میں رکھے ہوئے چراغ کو بجھانے سے پہلے ہی کھاٹ پر دراز ہو گئی تھی تو اس کی تنہائی نے ایک نہایت شدید صورت اختیار کر لی۔ اس کے کمرے میں جلتی ہوئی لالٹین پر پتنگوں کی اڑانوں نے ایک گول مول سا جالا بن دیا تھا۔ وہ زیور اتار کر صندوقچی میں رکھنے لگی۔ پاؤں کے انگوٹھوں سے چھلے اتار کر اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ ہونٹوں کی سرخی کو رگڑ دیا۔ مانگ ہتھیلی سے مل کر الجھا دی اور پھر اچانک چونک کر گلابی دوپٹے کو پلنگ پر پٹخ دیا اور سیاہ رنگ کی ایک چادر اوڑھ لی۔ دہلیز سے لگ کر باہر صحن میں جھانکنے لگی جہاں چراغ کی مری مری روشنی سے پار اندھیرا سنسنا رہا تھا۔ باہر گلی کے کسی گڑھے میں مینڈک ٹرا رہے تھے اور بہت دور رسالدار کا تبتی کتا آٹے کی مشین کے سے تسلسل سے بھونک رہا تھا۔

اس نے پلنگ پر بچھی ہوئی چادر کی شکنیں دور کیں۔ فرش پر سے چند غیر مرئی چیزیں اٹھا کر باہر پھینک آئی۔ لالٹین کو دروازے کے ایک کیل سے لٹکا دیا۔ پتنگوں کا دائرہ ٹوٹ گیا اور پھر زیادہ تیزی سے لالٹین کے اردگرد گھومنے لگا۔ باہر جا کر اس نے دیا بجھا دیا۔ مینڈکوں کی آواز بلند ہو گئی اور کتا جیسے ہوا میں اڑ کر آیا اور اس کی چھت پر بھونکنے لگا۔ آسمان جسے چراغ کی روشنی نے بہت بلند کر رکھا تھا' اپنے ستاروں کو معمول سے زیادہ چمکاتا جیسے اس کے آنگن

پر جھک آیا۔ اور بوڑھا نیند میں اس زور سے کھانسا جیسے اس نے حلق میں طبلہ پھنسا رکھا ہے۔

حویلی کے دروازے پر جا کر وہ چپ چاپ گلی میں کوئی آواز سننے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کے سامنے دو بلیاں ایک دوسری کا تعاقب کرتی گولیوں کی طرح سن سے گزر گئیں۔ چوکیدار نے گلی کے نکڑ پر خبردار کا نعرہ لگایا اور پلٹ گیا۔ کچھ دیر بعد مسجد کے مولوی صاحب "ربنا ظلمنا انفسنا" بلند آواز میں پڑھتے گلی کے دوسرے سرے پر غائب ہو گئے۔ مسجد میں عشا کی نماز بھی ادا کی جا چکی تھی——

تو شاید وہ نہیں آئے گا—— وہ آج بھی نہ آیا تو آخر کب آئے گا؟

مگر شاید وہ اب نہیں آنے کا—— وہ آئے گا—— تاریکیوں کی تہوں میں چنگاری سی کلبلا کر پکارتی' مگر پھر وہ دب کر رہ جاتی۔ سنسان گلی میں بھگدڑ سی مچ جاتی' قدموں کی آہٹیں کڑکتے ہوئے گولوں کی طرح فضا میں گونج اٹھتیں اور وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں آگرتی۔ ہانپتے ہانپتے تھک جاتی تو ایک سانس لے کر اٹھتی۔ دبے پاؤں حویلی کے دروازے پر جاتی اور جب اس کی ہتھیلیاں بھیگ جاتیں اور ماتھا ٹین کے پترے کی طرح تپ جاتا تو بوڑھوں کی موجودگی سے بے پروا ہو کر بھاگتی اور صاف پلنگ پر شکنوں کا جال بچھا دیتی۔

اور پھر معاً" اس کے چہرے کے خطوط تن گئے' ہونٹ بھینچ گئے۔ آنکھوں میں نمی کی جگہ شراروں نے لے لی۔ شادی کے سبز بکس کی تہہ میں سے اس نے ہاتھی دانت کا ایک ننھا سا سنگاردان اٹھایا اور اسے بغل میں دبا کر دہلیز تک آئی' تو جیسے ہوا میں تیرتے ہوئے کسی وجود نے اسے دھکا دے دیا اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی پرلی دیوار تک چلی گئی۔ نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر وہ دروازے میں سے یوں نکلی جیسے لوہے کی چادر میں شگاف ڈالنے چلی ہے۔ صحن کو عبور کرتی باہر گلی میں آ گئی۔ گلی کے سرے سے چوکیدار نے "خبردار" کا نعرہ

لگایا اور پھر وہیں بیٹھ کر ایک اداس سا گیت گانے لگا۔ پلٹ کر اس نے گلی کے دوسرے سرے کا رخ کیا۔ پانی کے گڑھے کے قریب سے گزری تو مینڈک خاموش ہو گئے۔ ایک دیوار پر سے غراتی ہوئی دو بلیاں گیندوں کی طرح اچھلتی کہیں دور نکل گئیں۔ رنڈوے مولوی جی اپنے صحن میں بکری سے باتیں کر رہے تھے۔ گلیاں عبور کرتی' موڑ کاٹتی' چپ چاپ ماحول میں ایک اداس سرسراہٹ بکھیرتی وہ بڑھتی چلی گئی۔ اس کی نظریں اندھیرے کی اتھاہ گہرائیوں میں جیسے کسی تاریک ترین نقطے پر جم گئی تھیں۔ اس کی رفتار تیز اور قدم متوازن تھے۔ رسالدار کا کتا چھت پر سے دور تک بھونکتا چلا آیا ——— اور پھر وہ ایک گلی کے نکڑ پر اچانک ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

سامنے کے مکان کی ایک کھڑکی کھلی تھی۔ سلاخوں کے پرے ایک کیل سے ایک میلی لالٹین لٹک رہی تھی ——— وہ اپنے گھر میں ہے ——— اس نے سوچا ——— مزے سے کہانیاں پڑھ رہا ہو گا' یا وہ شعر جو اس نے بہت کم سمجھے' مگر سارے کے سارے سنے' یا شاید اپنی ہونے والی منگیتر کے نام خط لکھ رہا ہو۔

کاش وہ خود بھی لکھ سکتی۔ کاغذ کے ننھے سے پرزے پر صرف یہ الفاظ لکھ دیتی ——— میں تمھارا سنگاردان تمھیں واپس کرنے آئی ہوں۔ یہ اپنی منگیتر کو بھجوا دو جس کا خوشبو میں بسا ہوا ایک خط تم نے مجھے دکھایا تھا۔ اور میرا گلابی ریشم کا رومال مجھے واپس دے دو جس پر میں نے پنسل سے تمھارا نام لکھوا کر یہ نام کاڑھا تھا۔ میں تمھارے نام کے دھاگے نکال کر اسے اپنے دولہا کو پیش کر دوں گی۔ مجھے ادھ کہی کہانیاں نہیں بھاتیں۔"

اس نے سیاہ چادر کے نیچے سے سنگاردان نکالا۔ دبے پاؤں کھڑکی کے پاس گئی اور دھیرے سے ہاتھ کو سلاخوں کے درمیان سے نکال کر سنگاردان کو دیوار سے لگی ہوئی کھرّی کھاٹ پر رکھ دیا۔ اس نے یہ بھی تو نہ دیکھا کہ حبیب کہاں ہے؟ وہ کونے میں پڑے ہوئے سٹول پر بیٹھا اونگھ رہا ہے ——— یا پلنگ پر

لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا ہے یا باہر آنگن میں ٹہل رہا ہے۔ سنگاردان رکھ کر وہ ایک بہت بڑے بوجھ سے آزاد ہو گئی۔ اس کے خیالوں کے دامن پر ماضی کی گرد کا ایک ذرہ تک باقی نہ رہا۔ ہاتھ مل کر وہ مڑی اور سیدھی گلی کی طرف ہو لی۔ اس کا ہر قدم پہلے قدم سے بے صبر اور اس کی ہر سانس پہلی سانس سے زیادہ تیز ہوتی گئی۔ اسے یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ جوالا رام کی دکان کے پاس دو آدمی بیٹھے کھسر پھسر کر رہے ہیں اور اسے دیکھ کر دیوار سے چمٹ گئے ہیں۔ اور بہت آگے جیوروں کے دروازے پر ایک ننھا سا کتا اچھل اچھل کر اس پر جھپٹنا چاہتا ہے۔ آخری نکڑ پر سے ہوا کی سی تیزی سے مڑتے ہوئے وہ ایک آدمی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی جو افیونیوں کی طرح اونگھتا چلا آ رہا تھا۔ سامنے اس کے کمرے کی لالٹین کی زرد زرد روشنی سے پڑوسیوں کی منڈیر چمک رہی تھی۔

ایک بگولے کی طرح وہ حویلی میں گھسی۔ گھڑونچی سے بچ کر دھڑام سے اپنے کمرے کی دہلیز پر گر گئی' اور جب اٹھی تو اس کے ہاتھ میں گلابی ریشم کا ایک رومال تھا جو لالٹین کی روشنی اور ہوا کے جھونکوں میں شعلوں کی طرح ناچ رہا تھا ——— ڈوبتے ہوئے چاند کی طرح!

❁ ❁ ❁

اِرتقاء

چاند خاں کے گال پر ایک بھرپور طمانچہ رسید کر کے بڑھیا نے محسوس کیا کہ اس کے اعصاب سلاخوں کی طرح اکڑ کر اس کی نسوں میں گھسے جا رہے ہیں۔ زبان جڑ تک خشک ہو چلی ہے اور کانوں میں تھالیاں بج رہی ہیں۔ حلق میں پھنسی ہوئی چیتھڑوں کی گیند کو اگلنے یا نگلنے کی کوشش میں اس نے بھوسلے سر کو کاندھوں تک اٹھے ہوئے گھٹنوں میں چھپا لیا اور چلائی "چاند کے ابا۔"

لیکن چاند کا ابا تو باہر گلی یا رام لال کے پتا پرشوتم داس سے خلافت کے زمانے کی باتیں کر رہا تھا اور پھر چاند خاں، جو دس برس کی عمر میں پہلی مرتبہ غصیلی ماں کے چانٹے سے لذت یاب ہوا تھا، کچھ دیر مبہوت رہنے کے بعد اس زور سے رونے لگا کہ پڑوسن بھی ہنڈیا کو خلاف معمول اکیلا چھوڑ کر دیوار پر سے جھانکی "اے کیا ہوا اللہ رکھے چاند خاں کو؟" ——— اور پھر ہنڈیا کی طرف لپکی ——— "چاند کے ابا!" بڑھیا کے گلے میں خشک چیتھڑوں کی گیند ٹھنس کر رہ گئی تھی۔ ادھر پرشوتم داس بڑا صابر سا لگ کر بیٹھ گیا تھا ——— "ان آنکھوں سے دیکھا سب کچھ، پر اب کتنا عجیب سا لگتا ہے۔ ایک ہی میدان میں ہندو اور مسلمان اور سکھ! کبھی مسلمان تقریر کرتا ہے، کبھی ہندو پنڈت اور سکھ گرنتھی۔ نعرے بلند ہوتے ہیں اللہ اکبر اور بندے ماترم اور ست سری اکال کے۔ گیت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گائے جاتے ہیں گاندھی اور محمد علی کے۔ کہیں چاند تارا نظر آتا ہے، کہیں چرخہ اور کہیں کرپانیں! ——— اور پھر بھائی پرشو! جانے کیا چپا پڑی کہ بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ آپس میں جھگڑنے لگے اور انگریز نے اطمینان کی سانس لی، اور اب تک اس کا اطمینان قائم ہے۔ اب تک مسجد اور باجا اور گائے اور جھٹکا کی رٹ چلی جا رہی ہے۔ وہی دنگے فساد ہیں اور چیخم دھاڑ ہے اور لوٹ کھسوٹ ہے، اور حاکم خوش ہے، اور ہم وہی کنوئیں کے مینڈک! ہر پھر کر وہیں کے وہیں۔ کاش ان میں پھر سے ایکا ہو جاتا۔ اور پرشو بھیا! یہ کوئی اتنی مشکل بات بھی تو نہیں۔ اب ہمارا یہ ننھا سا گاؤں ہے۔ ہندوؤں سکھوں کے یہی آٹھ دس گھر ہوں گے پر خدا لگتی کہنا پرشو بھیا! کبھی تمھیں یا تمھارے بھائیوں کو ہم مسلمانوں نے چھیڑا؟ نہیں نا؟ کتنے میٹھے لگتے ہو تم جب ہماری خوشیوں اور غموں میں شریک ہوتے ہو۔ تمھیں یاد ہے نا گئے برس تمھارا کوئی پنڈت آیا تھا یہاں۔ مندر میں روشنی کی ضرورت پڑی تو ہم نے اپنی مسجد کا گیس بھجوا دیا، یاد ہے نا؟ یہ بھولنے کی باتیں ہی نہیں۔ اور اب تم یہ شکایت لے کر آئے ہو کہ چاند نے رام لال کے گھونسا مارا اور اس کی وجہ یہ بتاتے ہو کہ تم ہندو ہو اور ہم مسلمان ہیں، اور تم کم ہو اور ہم زیادہ ہیں۔ ارے بھیا پرشو! ایسی ہی بات تھی تو مسلمانوں کے ڈیڑھ دو سو گھروں کے مقابلے میں تمھارے سات آٹھ گھروندے کیا حقیقت رکھتے تھے۔ ٹھیک ہے نا؟ پھر میں حیران ہوں کہ تمھارے منہ سے ایسی بات کیوں نکلی!" ——— بوڑھا مونچھوں اور داڑھی میں اٹکے ہوئے جھاگ کے قطروں کو پونچھنے کے لیے رکا۔

پرشوتم داس نے پہلو بدل کر کہا "اخباروں میں پڑھا ہے کہ جہاں جہاں مسلمان زیادہ وہاں ہندوؤں کو رہنے نہیں دیں گے اور ہولے ہولے چوری چھپے مسلمانوں نے یہ کام شروع بھی کر رکھا ہے۔"

بوڑھے کی سنجیدگی پر غصہ غالب آگیا "تو کیا میں کُل ملکی لاٹ ہوں کہ

ہر مسلمان کا ذمہ اٹھا لوں۔ ارے ایک بار نہیں' دو بار نہیں' سو بار کہا کہ دونوں بچے تھے۔ چاند نے غلطی کی جو رام لال کے گھونسا مارا۔ تم ساری بات کو یوں سمجھنے کی کوشش کرو کہ ایک بچے نے دوسرے بچے کو پیٹا۔ مسلمان اور ہندو کا جھگڑا بیچ میں نہ گھسیٹو۔ قسم خدا کی! دوسرے مسلمان کی نیتوں کی تو وہی جانے' اپنے بارے میں تو اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میرے دل میں تمھاری طرف سے کبھی میل نہیں آیا۔ تم میرے خدا کو اچھا کہتے ہو' میں تمھارے پرماتما کی عزت کرتا ہوں۔ تم نے میرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر انگلی نہیں اٹھائی' میں نے تمھارے رام میں کوئی نقص نہیں نکالا۔ اس حالت میں کیا میرا دماغ خراب ہوا ہے کہ اپنے معصوم بچے کے دل میں تمھارے خلاف نفرت کا بیج بو دوں' لعنت ہو ان اخباروں پر۔"

پرشوتم داس نے اٹھتے ہوئے کہا "میرا مطلب یہ تھا کہ ذرا سمجھا دو اسے۔"

"یہ تو میرا فرض ہے" بوڑھا بولا "تم نہ کہتے تو بھی میں اسے سمجھا دیتا۔"

پرشوتم داس جاتے ہوئے بولا "ایک چانٹا لگ جائے اس کے' تو بہتر رہے گا۔"

"نہیں بھئی' چانٹا نہیں لگنے کا۔" بوڑھے نے کہا "خفا نہ ہونا۔ چاند کے گال چانٹوں کے لیے گلابی نہیں بنائے۔ باتوں باتوں میں سمجھا دوں گا' سعادت مند بیٹا ہے' باپ کا کہا نہیں ٹالے گا۔"

"مرضی تمھاری" پرشوتم داس نے نکڑ پر سے مڑتے ہوئے کہا۔

"چانٹا لگ جائے۔" بوڑھا بڑبڑاتا ہوا گھر کو پلٹا "چاند کے چانٹا لگ جائے! ان ہاتھوں میں کیڑے نہ پڑ جائیں جو چاند کو چانٹا لگائیں!"

"چاند کے ابا" چیتھڑوں کی گیند بڑھیا کے حلق میں پوری شدت سے

پھنسی ہوئی تھی۔ "چاند کے ابا۔"

بڑھیا کی پکار اور چاند کے رونے کی آواز سن کر بوڑھا لپکا۔ چاند کو گلے لگالیا اور پیار سے پوچھا "کیا ہوا؟ کیا ہوا میرے چاند کو؟"

"میں نے چاند کو چانٹا لگا دیا——غلطی سے۔" بڑھیا بھوسیلے سر کو سوکھے سڑے گھٹنوں کے شکنجے سے نکال کر اور باہیں پھیلا کر چاند کی طرف بڑھی' اور اسے چوم لینا چاہا۔ مگر بوڑھا پیچھے ہٹ گیا اور بولا "نہیں چومنے دوں گا۔ خود ہی چرکا لگاتی ہے' خود ہی پھاہا رکھتی ہے اس پر۔ دس برس کی قسم توڑ ڈالی۔ ہاتھ نہ کٹ گئے تیرے جب تو نے اس پر دس برس کی قسم توڑ ڈالی۔ ہاتھ نہ کٹ گئے تیرے جب تو نے اس گلاب کے پھول——"

مگر بڑھیا نے جھپٹ کر چاند کو چوم لیا۔

پڑوسن ایک مرتبہ پھر دیوار سے جھانکی "پہلی بار رویا ہے چاند—— کیا ہوا؟"

"اے بی ہونا کیا تھا' مجھ نباب جادی نے غصے میں آ کر——" بڑھیا رک گئی' کیونکہ پڑوسن ہنڈیا کی طرف لپک گئی تھی اور دیوار پر پڑوسن کے سر کی بجائے ایک کوا بیٹھا تھا۔

"پگلی۔" بوڑھا بڑبڑایا اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

چاند کے چانٹا لگ جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ بوڑھے بڑھیا کو اپنے اس اکلوتے وارث کی اہمیت کا ضرورت سے زیادہ احساس تھا۔ ۱۸۔۱۹۱۴ء کی جنگ میں یورپی قوموں کی بقا کے لیے وہ اپنے دو نوجوان بیٹے قربان کر چکے تھے۔ بیٹوں کی موت کی اطلاع کے دو روز بعد انھیں چھوٹے بیٹے کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط ملا تھا کہ اب وہ بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح مونچھوں کو تاؤ دیتا ہے' اور فرانس کی ایک لیڈی نے اس کی مونچھوں کے سنہری تار دیکھ کر کمپنی کمانڈر سے کہا ہے کہ یہ سپاہی بالکل فرانسیسی لگتا ہے!——اس روز وہ

دونوں کتنا روئے تھے۔ اندھیرے کوٹھے کے کواڑوں کو زنجیر چڑھا کر انہوں نے لٹے ہوئے انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ ایک ساتھ ان کی آنکھوں میں آنسو آئے تھے' ایک ساتھ وہ بلبلا اٹھے تھے اور پھر ایک ساتھ ان کے لبوں سے ایک ہی لفظ نکلا تھا۔ "قسمت!۔"

۱۹۱۸ء میں جب خاتمۂ جنگ کا اعلان ہوا اور ان کے ضلع کے صدر مقام میں کسی صاحب نے دربار لگایا تو وہ بھی جا پہنچے کہ فرانس کی خاک میں دبی ہوئی ان سنہری مونچھوں کا واسطہ دے کر صاحب سے یہ التجا کریں کہ وہ انھیں ہل' ٹلائی' رکھوالی اور کٹائی کے جھنجھٹوں سے چھٹکارا دلائے' لیکن سنہری پٹیوں اور سرخ کوٹوں والے نمرود صورت اردلیوں نے انھیں دھتکار دیا۔ بڑھیا مدت تک بوڑھے کو کوستی رہی کہ اس نے اپنی پگڑی کو کلف کیوں نہ لگوائی' جبکہ دربار میں رسائی کا ذریعہ مرے ہوئے بیٹوں کے بجائے کلف لگا طرّہ اور تیل لگی مونچھیں تھیں۔

ان کی گودیں اجڑ چکی تھیں۔ مستقبل کی چمک کو گرہن لگ چکا تھا۔ امیدوں نے اپنے ہاتھوں اپنی چھاتیوں میں خنجر گھونپ لیے تھے۔ تحریک خلافت کے دنوں میں اچانک بوڑھے کے دل میں اپنے بیٹوں کی یاد ایک عجیب زہریلی صورت اختیار کر گئی۔ گاؤں بھر میں بلند ترین جھنڈا اس کا تھا' بلند ترین نعرہ اس کا تھا' بلند ترین دعویٰ اس کا تھا۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود اس نے بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کیں اور دہقانوں کا محبوب نمائندہ بن گیا۔ ایک مرتبہ اس نے یہاں تک کہہ دیا: "خاک پڑے اس جینے پر جس جینے کے لیے ہمیں اپنے جیسے انسانوں سے کھل کر سانس لینے کی بھیک مانگنا پڑے۔ میں پوچھتا ہوں یہ کہاں کا قانون ہے کہ ہمیں آنسو بہانے کے لیے بھی اشٹامپ پر ایک درخواست لکھ کر پیش کرنا پڑتی ہے اور ادھر سے جواب ملتا ہے: نہیں' تم آنسو نہیں بہا سکتے۔ تم آنسو بہاؤ گے تو تمھاری آنکھیں پھوڑ دی جائیں گی ——— مگر

آج میں ان عالی جنابوں کو جتا دینا چاہتا ہوں کہ تم پہلے آنسوؤں کی اجازت نہیں دیتے تھے' اب دل کا غبار نکالنے کے لیے تمھارے سامنے تمھاری اجازت کے بغیر یہ آنکھیں شرارے اگلیں گی' اور یہ شرارے تمھارے خس وخاشاک پر گریں گے اور تمھارے خس وخاشاک میں گرتے ہوئے ان شراروں کو ہماری آہیں ہوا دیں گی' اور جب شعلے بھڑکیں گے تو ہم ان شعلوں کے اردگرد ناچیں گے اور گائیں گے کہ:۔

یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

اُسی روز پولیس بوڑھے کو گرفتار کر کے لے گئی۔ بڑھیا نے جب یہ خبر سنی تو درد آمیز مسرت سے چیخ کر بولی: "اب میری باری ہے۔ میرا خدا مجھے بلا رہا ہے' میرا رسول مجھے بلا رہا ہے' میرا دستگیر مجھے بلا رہا ہے' میرا محمد علی مجھے بلا رہا ہے' مجھے میرے بیٹے بلا رہے ہیں' مجھے میرا فرض بلا رہا ہے" ——— مگر اسی وقت ایک جہاندیدہ عورت نے اسے الگ سمجھایا کہ عورت کا سب سے بڑا فرض اپنی امانت کی حفاظت ہے۔ خدا اور رسول بھی اسی طرح خوش رہ سکتے ہیں کہ تو اپنی امانت کو گزند نہ پہنچائے اور وہ امانت تیرے پیٹ میں ہے۔"

بوڑھے کو چھ ماہ قید بامشقت کی سزا ملی اور اس کے جھنڈے کو ایک اور مجاہد نے تھام لیا۔ "کاش اس وقت میرے بیٹے زندہ ہوتے!" بڑھیا نے چھت پر سے مسجد کے صحن میں بلند جھنڈے کو لہراتے دیکھ کر کہا تھا۔ اور جب بوڑھے کی رہائی میں صرف ایک مہینہ باقی رہ گیا تو اسے جیل ہی میں اطلاع ملی کہ جس وقت لوگ عید کا چاند دیکھ رہے تھے تو ٹھیک اسی وقت وہ ایک لڑکے کا باپ بنا۔ جیل میں مٹھائی تو خیر کیا بٹتی' البتہ اس نے مٹھائی سے بھی لذیذ چیز سے قیدیوں کو محظوظ کیا۔ اس نے اپنے ہم نصیبوں کو ایک مولود شریف سنایا:۔

اللہ کی اس پیاری نگری میں دیر تو ہے اندھیر نہیں

"چاند خاں!" اس نے اندھیری کوٹھڑی کے تھڑے پر لیٹتے ہوئے کہا

تھا۔ "میں اپنے ننھے کو چاند خاں کے نام سے پکاروں گا' اور جب اس کی مسیں بھیگیں گی' جب اس کی سنہری مونچھیں اگیں گی' تو میں اسے محمد علی کی فوج میں بھرتی کرا دوں گا۔ پھر چاہے وہ دلی میں مارا جائے' چاہے فرانس میں' چاہے ——مگر نہیں' وہ نہیں مرے گا۔ چاند نہیں مر سکتا۔ چاند مرجائے تو دنیا رانڈ ہو جائے۔ چاند کیسے مر سکتا ہے"!

"چاند خاں!" جیل سے باہر اس کے رشتہ داروں نے اسے ننھے کا نام بتایا اور وہ اس زور سے ہنسا کہ جیل کے صدر دروازے کی کھڑکی میں سے ایک ہراساں سنتری نکلا اور اس کے قریب آ کر بولا "ذرا ہولے ہنسو بھیا' صاحب بہادر نے سن لیا تو پھر ٹھونس دیں گے جیل میں۔"

بوڑھے نے مسکرا کر کہا "جو ساری عمر کے لیے خود ٹھنسے ہوئے ہیں جیل میں' وہ دوسروں کو کیا ٹھونسیں گے بے کالے خان۔ اب ہم آزاد ہیں۔ ہم چاہیں تو ہنستے ہنستے اپنے پھیپھڑوں کی دھجیاں اڑا دیں۔ ہم ہنس رہے ہیں' خلافت کے جلسے میں تقریر نہیں کر رہے۔ سمجھے کالے خان!" اور اس نے کالے خان کی بڑی بڑی مونچھوں پر سے چٹکی سے ایک تنکا اڑا دیا۔

گھر آ کر اس نے چاند خاں کو اتنا چوما کہ وہ بلکنے لگا۔ مگر وہ پاگلوں کی طرح اسے چومے جا رہا تھا اور کہہ رہا تھا: "میں نے تیرے بھائیوں کو کئی بار پیٹا۔ آج جب مجھے وہ گوری گردنیں اور روشن آنکھیں اور بیضوی ٹھوڑی یاد آتی ہیں تو سوچتا ہوں میں نے انھیں کیوں پیٹا۔ میں تمھاری گردن اور آنکھوں اور ٹھوڑی پر بوسوں کا پہرہ بٹھا رہا ہوں' تاکہ جب میرا یا تیری ماں کا یا کسی اور کا ہاتھ طمانچے کے لیے اٹھے' تو یہ بوسے اس ہاتھ کو ڈس لیں۔ تو مارے جانے کے لیے نہیں پیدا ہوا۔ تو صرف مارنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ تجھے محمد علی اور گاندھی کی فوج میں بھرتی ہونا ہے۔"

"ان کی تو آپس میں چل گئی۔" چاند خاں کی ماں بولی۔ "کل کی خبر

ہے' بگڑ بیٹھے محمد علی' کہتے ہیں' گاندھی کٹر ہندو ہے۔ گاندھی کہتے ہیں' نہیں میں کٹر ہندوستانی ہوں——اور انگریز خوش ہے' اور——"

"اور ہم لٹ گئے۔" بوڑھے نے چاند خان کو کھاٹ پر ڈالتے ہوئے کہا "اگر یہ بات ٹھیک ہے تو ہم لٹ گئے۔ سارا ہندوستان لٹ گیا۔ مگر نہیں' وہ شعلہ نہیں بجھ سکتا جو ان بزرگوں نے ہمارے دلوں میں بھڑکایا ہے۔ یہ شعلہ بجھ جائے تو آزادی رانڈ ہو جائے۔ یہ شعلہ کیسے بجھ سکتا ہے"!

یہ شعلہ بوڑھے کے دل میں برسوں بھڑکتا رہا۔ جس روز چاند خاں نے رام لال کے گھونسا مارا تو اس شعلے نے دھوئیں کا ایک طوفان اچھالا اور دھوئیں کا طوفان اس نے پرشوتم داس کے سامنے اگل ڈالا۔ اور جب اس واقعے کے دو برس بعد اس نے سنا کہ محمد علی پردیس میں چل بسے تو اس بھوبھل پر ایک بگولا جھپٹا۔ چنگاریوں کا ایک مینار بلند ہوا۔ یہ مینار اس کے ذہن کی وسعتوں میں رقصاں و جولاں رہا۔ اس روز اسے کسی پہلو قرار نہیں ملتا تھا۔ چاند کو دیکھ کر کہتا تھا "میرے بچے! تیرا سپہ سالار مرگیا۔" اپنے اداس خلافتی ساتھیوں کو دیکھ کر کہتا تھا "میرے رفیقو! تمھارا سرپرست چل بسا۔" مسجد میں جا کر مولوی صاحب سے کہا "میاں جی! میاں جی! ہماری ملت کا سہاگ لٹ گیا۔"

"کیا ہوا؟" مولوی صاحب نے نسوار کی چٹکی کو نتھنوں کے رستے دماغ کے بعید ترین گوشوں تک چڑھا کر پوچھا۔

"آپ کو کچھ معلوم نہیں؟" وہ تعجب سے بولا "محمد علی چل بسا!"

"وہی خلافت والے؟" مولوی صاحب نے نسوار کی باقیات کو کاندھے پر پڑے ہوئے نیلے رومال سے رگڑتے ہوئے پوچھا۔

"جی وہی خلافت والے' شوکت علی کے بھائی۔"

"جنھوں نے انگریز سے روپیہ لیا تھا؟" مولوی صاحب نے مسواک کو بالشت سے ناپتے ہوئے کہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور بوڑھے پر وحشت سی سوار ہوگئی "جی نہیں۔ جس نے کافروں سے آپ کی مسجدوں اور تسبیحوں کو آزاد کرانے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دی، جسے آپ جیسے ملاؤں نے ——" اس کی آواز بھرّا گئی اور وہ منہ میں کپڑا ٹھونستا آنکھیں پونچھتا پلٹ آیا۔

سرما کی طویل راتوں میں جب کڑوے تیل کے دیے کی لو دھوئیں کی ننھی لہریں چھوڑتی، اور دیواروں پر ٹنگی ہوئی چنگیروں اور چھاجوں کے پیچھے ٹڈیاں سنگیت سجا جاتیں، تو وہ چاند کو اپنے پاس بٹھا لیتا۔ اسے خلافت کے زمانے کے قصے سناتا اور اس سے وعدہ لیتا کہ جب ایک مرتبہ پھر یہ شعلہ بھڑکے گا تو وہ اس میں بے خوف کود جائے گا اور یہ نہیں سوچے گا کہ ابھی اس کی عمر چھوٹی ہے یا اس کے ماں باپ بوڑھے ہیں، ——"اور میرے چاند، شعلے کا کام صرف جلانا ہی نہیں، وہ کندن کر دینا بھی جانتا ہے۔"

۱۹۳۹ء میں جب ہمیشہ کی طرح یورپ ہی کی تہذیب گاہ اور مغرب کے امن کدے سے جنگ کا غلغلہ بلند ہوا اور جب ہندوستان میں نئے سپاہیوں کی طوفانی بھرتی شروع ہوئی، تو چاند ایک بانکا سجیلا گبھرو تھا۔ بوڑھے کو اس امر کا احساس تھا کہ دوران جنگ میں سپاہیوں کے والدین کو دنیاوی لحاظ سے ہر قسم کی سہولت میسر ہوگی اور پھر چاند کی ملازمت کے بغیر اس کی شادی کا سامان بھی جمع کرنا مشکل تھا۔ مگر تحریکِ خلافت کی آگ میں پکا ہوا دماغ ان مادی منفعتوں کے متعلق سوچنا تک گوارا نہیں کرتا تھا۔ اس کے دل میں صرف ایک ہی لگن تھی ——کاش وہ اپنے بیٹے کی تربیت کے خواب کی تعبیر دیکھ لے اور جیتے جی ایک مرتبہ پھر محسوس کر سکے، ابھی غلاموں کے ذہنوں سے آزادی کا تصور محو نہیں ہوا۔ اس راکھ میں ابھی کئی سخت جان چنگاریاں چھپا رہی ہیں جن کو ہوا د۔ کے لیے ایک اور محمد علی کی ضرورت ہے۔

اور وہ محمد علی ثانی اس کے ذہن کے افق پر طلوع ہو چکا تھا۔

چند مہینوں میں گاؤں نوجوانوں سے بالکل خالی ہو گیا۔ چاند ویران گلیوں میں بے مقصد پھرتا۔ چوپال پر جاتا تو بوڑھوں سے بلغم کی زیادتی اور معدے کی کمزوری کے قصے سنتے سنتے تھک جاتا۔ باہر کھیتوں میں گھومتا پھرتا۔ گھر آ کر بوڑھی ماں سے بے معنی باتیں کرتا۔ مدرسے کے منشی جی سے اخباروں کی اطلاعات سننے چلا جاتا، مگر جب رات آتی تو وہ اس انتظار میں رہتا کہ کب کھانے سے فراغت ملے اور وہ اپنے باپ کی پنڈلیوں کو دابے اور اس سے پوچھے:

"اچھا تو ابا پھر کیا ہوا؟ مولانا محمد علی نے پھر کیا حکم دیا؟"

ایک روز چاند نے منشی جی سے یہ خبر سنی کہ نئے محمد علی نے مسلمانوں کو جنگ میں پوری پوری امداد کی تلقین کی ہے اور کہا ہے کہ صرف جرمنی کی شکست ہی اسلامی ممالک کو آزاد رکھ سکے گی۔ وہ بھاگا بھاگا گھر آیا۔ بوڑھا اس وقت مسجد جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ یہ خبر سن کر اچھل پڑا۔ ہم ہندوستانی تو خیر ہیں ہی قسمت کے ہیٹے، لیکن یہ ترکی اور مصر اور عراق اور ایران ——ان سب پر جرمنی کی نظر ہے کیا؟ کیا وہ ہماری اجڑی محفل کے ان مدھم چراغوں کو بھی بجھا دیں گے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمارا محمد علی ٹھیک کہتا ہے۔ اور میرے بیٹے! اب میں چاہوں بھی تو تجھے نہیں روک سکتا——پر میری ایک بات یاد رکھیو۔ تو چند کوڑیوں کے لیے جنگ میں نہیں جا رہا، تو ساری دنیا میں آزادی اور امن کا جھنڈا بلند کرنے جا رہا ہے۔"

وہ صبح بہت روشن اور چلبلی سی تھی جب چاند خاں اپنے والدین سے رخصت ہو کر گاؤں سے باہر آیا۔ کچھ دور جا کر اس نے پلٹ کر گاؤں پر ایک نظر ڈالی۔ اپنے مکان کی چھت پر اسے دو گٹھڑیاں سی پڑی نظر آئیں۔ اور اس نے پگڑی اتار کر اچھالی۔ ادھر سے بھی ایک گٹھڑی کھل گئی اور ایک کپڑا ہوا میں پھڑپھڑانے لگا۔ بھیگی ہوئی آنکھوں کو پگڑی سے پونچھتا وہ علاقے کے صدر

مقام پر آیا جہاں اس پر کئی شکاری جھپٹے لیکن اس نے یہ کہہ کر سب کو مایوس کر دیا کہ وہ اسلام اور آزادی کے لیے اور اپنے محمد علی کی اجازت سے بھرتی ہو رہا ہے۔ "اگر آپ کو کسی سند کی ضرورت ہے تو مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میرے معاملے میں آپ کو مایوسی ہو گی۔"

جبل پور میں ابتدائی تربیت کے بعد اسے محاذ جنگ پر بھیج دیا گیا۔ ادھر ہر مہینے گاؤں میں اس کی تنخواہ بوڑھے کو ملنے لگی اور بڑھیا نے کپڑوں اور زیورات سے صندوقچے ٹھونسنے شروع کیے۔ ایک جگہ رشتے کی بات بھی پکی کر آئی۔ خیالوں نے محل پر محل تعمیر کیے۔ مستقبل کے ویرانے میں امیدوں کے سرسبز پیڑ ابھرے اور ہر طرف آبادی ہی آبادی اور ہریالی ہی ہریالی نظر آنے لگی۔

اُن دونوں بوڑھے کا محبوب ترین مشغلہ مدرسے کے منشی جی سے اخباروں کی اطلاعات سننا تھا۔ دن بھر جو کچھ سنتا' وہ رات کو بڑھیا کے حوالے کر دیتا۔ دونوں دیر تک نئے واقعات پر خیال آرائیاں کرتے رہتے۔ چاند کے لیے دعائیں مانگتے۔ دیے کی لَو کانپتی' چنگیروں کے پیچھے ٹڈیاں طویل الاپ چھیڑتیں' باہر صحن میں نیم کی شاخوں میں ہوا گاتی۔ چاند ابھرتا تو کواڑوں کی کھلی جھریاں نقرئی لکیریں بن جاتیں اور جو موضوع بھی چھیڑتے وہ ہر پھر کر چاند پر مرکوز ہو جاتا۔

"لاہور میں ہمارے محمد علی نے ایک بہت بڑا جلسہ کیا ہے۔" ایک روز بوڑھے نے کہا "اور انگریز کو بتایا ہے کہ ہندو مسلمان کبھی اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ ان کا مذہب' چال ڈھال' رہن سہن' لباس خوراک سب کچھ الگ ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ جہاں جہاں مسلمان زیادہ ہیں وہاں مسلمانوں کی حکومت ہو اور جہاں جہاں ہندو زیادہ ہیں وہاں ہندوؤں کی حکومت ہو۔ اس طرح ہندوستان میں رہنے والے دو بھائی' جو ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے ہیں' الگ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

الگ ہو کر چین کی زندگی بسر کر سکیں گے۔"

"معقول بات ہے" بڑھیا نے کہا اور اس کی مسکراہٹ کا محیط وسیع ہو گیا۔ "جیتا رہے ہمارا محمد علی!"

"جیتے رہیں وہ سب لوگ جو آزادی کے عاشق ہیں۔" بوڑھا بولا۔

"اری پگلی! چاند تارا زمین کی کسی نگری میں بھی نہیں بدل سکتا۔ چاند ساری دنیا پر چاندنی نچھاور کرتا ہے۔ تارا ساری دنیا کے مسافروں کو راہ دکھاتا ہے۔ اور آسمان پر صرف ایک چاند ہے اور اس کے ہمیشہ ساتھ رہنے والا صرف ایک تارا ہے——مگر تجھے کیسے معلوم ہوا کہ چاند سمندر پار بھی اپنا چاند تارا نہیں بھولا۔"

بڑھیا مسکراہٹ کو روکنے کے باوجود مسکرائے جا رہی تھی۔ مجھ نگوڑی میں بڑی خرابی ہے کہ من کی بات نہیں چھپا سکتی تمہارے سامنے۔ اب کہہ ہی دوں ساری بات۔ آج چاند کا خط آیا ہے۔ میں نے یونہی کھول لیا تو اوپر چاند تارے کا نشان بنا ہوا تھا۔ تب سے ہنسی رکتی ہی نہیں کمبخت۔" وہ بھاگ کر سرپوش میں سے خط نکال لائی۔ دونوں کھٹولے پر بیٹھ گئے۔ سبز روشنائی سے بنے ہوئے چاند تارے کو پہلے بوڑھے نے چوما' پھر بڑھیا نے' اور اس کے بعد بوڑھے نے خط پڑھنا شروع کیا:

"بہت سی ایسی باتیں ہیں جو میں لکھنا چاہتا ہوں' مگر لکھنے کی اجازت نہیں۔ صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ میں نے حضرت پیر دستگیر سبحانی کے روضہ مبارک کی زیارت کی۔"

"تو پھر میرا چاند بغداد میں ہے۔" بڑھیا نے مارے خوشی کے اپنے دونوں ہاتھوں کو جکڑ کر ٹھوڑی پر رکھ لیا' مگر بوڑھا خط پڑھتا گیا۔

"وہاں میں نے دعا مانگی کہ اے اللہ! مجھے اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے اس نیک بندے کی برکت سے اس راہ پر قربان ہو جانے کی

توفیق عطا فرما' جو مجھے میرے ابا بچپن سے دکھاتے چلے آئے۔ اور ابا جان! جب میں یہ دعا مانگ چکا تھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسی روضہ شریف میں مرحوم محمد علی تشریف لے آئے ہیں اور میری دعا میں شامل ہو گئے ہیں۔"

خط پڑھتے پڑھتے بوڑھے کی آواز بھرا گئی' اور وہ آنسو پونچھنے کے لیے ایک طرف پلٹا۔ بڑھیا گھگیا کر بولی "روتے کیوں ہو؟

بوڑھا مسکرا کر بولا "تم بھی تو رو رہی ہو۔ ہم دونوں اس لیے رو رہے ہیں کہ ہمارا چاند سچ مچ کا چاند نکلا۔ اب وہ بڑھ رہا ہے' ابھر رہا ہے' اس کے نور سے ہمارے دلوں کی دنیا منور ہو رہی ہے' اب وہ چاند پورا بن جائے گا ——جب وہ پورا چاند بن جائے گا——" بوڑھا گھبرا کر اٹھ بیٹھا' اور بڑھیا کے شکوک کو دور کرنے کے لیے ایک لمحے میں فقرہ مکمل کرنے کے کئی طریقے سوچ لیے اور آخر بولا: "جب وہ پورا چاند بن جائے گا تو اپنے آپ کو سورج کے حوالے کر دے گا۔"

"سورج؟" بڑھیا چونک پڑی۔

"ہاں ہاں" ' ہمارا نیا محمد علی ہماری دنیا کا سورج ہی تو ہے۔" بوڑھا کامیاب ہو گیا تھا اور بڑھیا چونکے ہوئے اعصاب کے تناؤ کو مسکراہٹوں کی پھوار سے نرم کرنے لگی تھی۔

چاند اب محاذ جنگ سے واپس آ کر کلکتے کی چھاؤنی میں مقیم تھا' اور دو تین مہینوں کے اندر رخصت پر آنے والا تھا۔ بڑھیا نے اس کی شادی کی تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ مکان کی سفیدی کرا لی تھی۔ ابھرے ہوئے کنکروں کو ہتھوڑی سے نکال کر صحن کو آئینہ بنا لیا تھا۔ ہر ڈاک میں چاند کے خط کی توقع ہوتی' اور جب خط نہ ملنے پر مایوسی ہوتی' تو رات کو بوڑھے سے ملک کی نئی خبریں سن کر دل کو ڈھارس بندھاتی۔

مگر اب تو چند روز سے بوڑھا عجیب عجیب خبریں سنانے لگا تھا۔

"میں گاندھی جی کی اتنی ہی عزت کرتا ہوں جتنی محمد علی کی مگر جانے کیا بات ہوئی کہ گاندھی جی نے مسلمانوں سے مشورہ کیے بغیر ایک فیصلہ کر لیا ہے اور انگریز سے کہا ہے کہ تم ہندوستان سے نکل جاؤ ورنہ تمھارے لیے اچھا نہ ہوگا۔"

"انگریز نے کانگرس کے بہت سے سرداروں کو جیل میں بھیج دیا ہے۔"

"سارے ملک میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی ہے' مگر مسلمان بالکل الگ ہیں۔ وہ کہتے ہیں' جب ہندو نے ہمارے ساتھ کوئی مشورہ ہی نہیں کیا تو ہمیں کیا پڑی ہے کہ اس آگ میں کودیں۔"

"ریل گاڑیاں پٹڑیوں سے اتر رہی ہیں' ڈاک خانے جلائے جا رہے ہیں' گولیاں چل رہی ہیں' کئی جگہ ہوائی جہازوں نے نیچے اتر کر مشین گنیں بھی چلائی ہیں۔ مگر ایک آگ ہے کہ پانی کا ہر چھینٹا اس پر تیل بن کر گرتا ہے۔"

"آج تین ریل گاڑیاں الٹ گئی ہیں' سوا سو مسافر مارے گئے۔ آج دو ریل گاڑیاں الٹ گئیں اور آٹھ ڈاک خانے جل گئے' ایک اسٹیشن کی عمارت کو بھی نقصان پہنچا۔"

"آج ایک اور ریل گاڑی الٹ گئی۔"

"عجیب بغاوت ہے۔" بڑھیا نے ایک روز کہا "کہ اپنے ہی غریب بھائیوں کو بغیر کسی قصور کے موت کے گھاٹ اتار دو۔"

مگر بوڑھا ان ہراساں سوالوں کا کوئی جواب نہ دیتا۔ اسے سیاسی معلومات پر بڑا ناز تھا مگر یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ آخر ایک جماعت نے دوسری جماعت سے مشورہ کر لینا کیوں ضروری نہ سمجھا۔ تو پھر کیا اس کی اور چاند کی تمام قربانیاں اکارت جائیں گی۔ اس کے ذہن کی بساط پر توقعات کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تمام مہرے پٹ جائیں گے‘ اور زندگی اسی طرح پابجولاں گھسٹتی دم توڑ دیگی۔

”گاندھی جی کیا کہتے اس بارے میں؟“ ایک روز بڑھیا نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا۔“ بوڑھا اب اس موضوع کو چھیڑنے سے کتراتا تھا۔

”بس اتنا سنا ہے کہ کانگریس کے ایک بہت بڑے سردار انگریزی پڑھ رہے ہیں‘ ایک صاحب ہمارے محمد علی کے خلاف ایک کتاب لکھ رہے ہیں‘ اور ایک اور صاحب انسانی زندگی کے ارتقاء پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں‘ اور تھوڑا لکھنا باقی ہے۔“

”ارتقاء؟

”ہاں ارتقاء“

”یہ کیا ہوتا ہے؟

”کوئی بڑی چیز ہو گی۔ بڑے آدمی بڑی چیزوں کے بارے ہی میں سوچتے ہیں۔“

اسی وقت کواڑ پر کسی نے دستک دی۔ بوڑھا بھاگ کر باہر آیا۔ قصبے سے ہرکارہ تار لے کر آیا تھا۔ ”کب آئے گا میرا لال؟“ ”بڑھیا نے ہرکارے کے کندھے کو جکڑتے ہوئے پوچھا۔ بوڑھے نے لفافہ چاک کیا۔ بڑھیا لپک کر دیا اٹھا لائی۔ انگریزی تحریر کے نیچے لکھے ہوئے چند اردو حروف دیے کی کانپتی ہوئی لو میں کانپے:

”چاند خان چھٹی پر آ رہا تھا‘ بلوائیوں نے پٹڑی اکھیڑلی تھی‘ اس لیے گاڑی الٹ گئی اور چاند خان شدید زخموں کی وجہ سے مرگیا۔ حکومت آپ کے ساتھ ہمدردی کرتی ہے۔“

دیا دہلیز پر گر کر بجھ گیا۔ تار کے فارم کو تیز ہوا صحن کے ایک کونے میں اڑا لے گئی اور حیات انسانی کا ارتقاء تکمیل کی آخری حدوں کو چھونے لگا۔

❁ ❁ ❁

چڑیل

جی ہاں‘ ہے تو عجیب سی بات‘ مگر بعض سچی باتیں بھی تو عجیب ہوتی ہیں۔ دن بھر وہ برساتی نالوں میں سے چقماق کی جھولیاں چنتی تھی اور رات کو انھیں آپس میں بجاتی تھی اور جب ان سے چنگاریاں جھڑنے لگتی تھیں تو زور زور سے ہنستی تھی اور پھر اس کی ہنسی شدید ہونے لگتی تھی۔ قہقہے چیخوں میں بدل جاتے تھے اور چیخیں گریے میں۔ اور جب آدھی رات کو لوگ یہ آوازیں سنتے اور کروٹیں بدلتے کہتے ”تو ہم پر رحمتیں برسا خاتون“ تو آسمان پر ستارے گنگنے لگتے۔ جھیل کی سطح سے چمٹے ہوئے چاند کو لطیف جھونکے لاتعداد دِیوں کی قطاروں میں تقسیم کر دیتے اور ہوائیں گھنی بیریوں میں سے سمٹ سمٹ اور لچک لچک کر نکلتی ہوئی گنگنانے لگتیں‘ اور یہ گنگناہٹ سنسناتے ہوئے سناٹے کا روپ دھار کر پہاڑیوں اور وادیوں پر مسلط ہو جاتی‘ اور صرف تبھی ٹوٹتی جب پو پھٹے گلابی کنکروں سے پٹی ہوئی ڈھیریوں پر ایک سایہ سامنڈلانے لگتا۔

اول اول جب وہ ان ڈھیریوں پر آئی تو چیت کے مہینے کی ایک رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ آسمان پر بادلوں کی جنگ جاری تھی اور برساتی نالے گرج رہے تھے۔ کسی کھوہ میں ایک گڈریا دبکا بیٹھا تھا۔ یہ قریب سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گزری تو گڈریا "چڑیل' چڑیل" پکارتا' چیختا چلاتا' کنکر اڑاتا اندھیرے میں جذب ہو گیا۔ دوسرے روز چرواہوں نے بہت دور سے اسے ڈھیریوں پر چقماق چھنتے دیکھا تو گڈریے کے واویلا میں سچائی کی رمق نظر آئی۔ گھروں کے صدر دروازوں پر تعویذ لٹکائے گئے۔ دہقانوں کے چھپروں کے اردگرد پیر جی کا دم کیا ہوا پانی چھڑکا جانے لگا اور نمبردار نے مولوی جی کو اپنے صحن کے عین وسط میں بٹھا کر کہا کہ یہاں تین مرتبہ قرآن مجید پڑھ کر چھو کرو اور پیٹ بھر حلوہ پاؤ۔ سنتا سنگھ جو راولپنڈی کے فسادوں کا حال سن کر گھر کی چار دیواری میں بند ہو کر رہ گیا تھا' باہر آیا اور مکان کے قفل پر سیندور چھڑک کر اندر بھاگ گیا۔ اور لالہ چونی لال نے اڑوس پڑوس کے پنڈتوں کو فوراً جمع کیا اور ایک بھجن منڈلی قائم کر دی۔ ھُو حق کے ورد اور رام نام کے جاپ سے گاؤں بھڑوں کے چھتے کی طرح سرسرانے لگا۔ اس روز مدرسہ بھی بند رہا' کیونکہ ماؤں نے اپنے کلیجے کے ٹکڑوں کو کلیجوں ہی سے چمٹائے رکھا اور استاد مدرسے کے برآمدے میں بیٹھ کر چڑیل کی باتیں کرتے رہے۔

مگر چند ہی دنوں کے بعد مراد نے گاؤں بھر میں یہ خبر پھیلا دی کہ وہ چڑیل نہیں۔

"چڑیل نہیں"! مولوی جی نے پوچھا تھا۔ "ارے بھئی تمہیں کیا معلوم کہ سکندر اعظم کے زمانے میں کالی ڈھیری کی چوٹی پر ایک ہندوستانی چڑیل نے ایک یونانی کی کھوپڑی توڑ کر اس کا گودا نگل لیا تھا جب سے اس ڈھیری پر کسی نے قدم نہیں رکھا۔ اور اکثر دیکھا گیا ہے' خود ہم نے دیکھا ہے' کہ طوفانی راتوں میں ڈھیری پر دیئے جلتے ہیں اور تالیاں بجتی ہیں اور ڈراؤنے قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں۔ دادا سے پوچھ لو۔"

دادا جسے قرآن مجید کی کئی آیات کے ترجمے سے لے کر ابابیلوں کی چونچ اور گدھ کی آنکھوں کے مرکب سے ایک اکسیری سرمے کا نسخہ تک یاد

تھا' بولا "کون نہیں جانتا۔ کوئی مائی کا لال کالی ڈھیری پر چڑھ کر تو دکھائے۔ کہتے ہیں اکبر بادشاہ دلی سے صرف اس لیے یہاں آیا تھا کہ اس چوٹی کا راز معلوم کرے۔ مگر مارے ڈر کے پلٹ گیا تھا۔"

مراد بولا "میری بات بھی تو سنو۔"

"ہاں ہاں بھئی۔" دادا نے کہا "سچ مچ مراد کی بات بھی تو سنو۔ ہمارے تمہارے جیسا نادان تو نہیں کہ سنی سنائی ہانک دے گا۔ پڑھا لکھا ہے' انگریز کو اردو پڑھاتا رہا ہے فوج میں ——— کہو بھئی مراد۔"

اور مراد بولا "چڑیل نہیں' بلا کی خوبصورت عورت ہے۔ اتنے لمبے اور گھنے بال ہیں اس کے کہ معلوم ہوتا ہے اس کے بدن پر گاڑھے دھوئیں کا ایک لہراتا ہوا سا خول چڑھا ہوا ہے اور رنگ تو اس غضب کا ہے کہ چاند کی کرنوں کی ایسی تیسی۔ آنکھیں بادامی ہیں۔ پتھر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھے تو چٹخا کے دھر دے۔ پلکیں اتنی لمبی اور ایسی شان سے مڑی ہوئی کہ تیر کمان یاد آ جائیں ——— اور دادا ———"

"کہتے جاؤ' کہتے جاؤ" دادا مسکرا رہا تھا۔

مولوی صاحب نے تسبیح پر سینکڑا ختم کر لیا تھا۔

اور مراد بولا "دادا ——— اس کے دونوں ابروؤں کے درمیان ایک نیلی سی بندیا بھی ہے!"

"ارے!" دادا جیسے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اور مولوی جی نے تسبیح کو مٹھی میں مروڑ کر ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا "میں نہیں کہتا تھا کہ کالی ڈھیری کی چڑیل ہے جس نے یونانی سپاہی کی کھوپڑی کا گودا نگلا تھا۔ یہ ماتھے کی بندیا ہندو عورت ہی کا تو نشان ہے۔"

"خدا لگتی کہوں گا مراد" دادا بولا "مولوی جی کی بات سچ رہی ہے۔ نفل پڑھو شکرانے کے کہ بچ کر آ گئے ہو ورنہ ———"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"نہیں وہ چڑیل نہیں۔" مراد کی آواز میں اعتماد تھا۔ "اگر چڑیلیں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں تو میں ابھی کالی ڈھیری پر جانے کے لیے تیار ہوں ـــــ مگر دادا ـــــ میرا دل کہتا ہے کہ وہ چڑیل نہیں۔"

"تو پھر کون ہے آخر؟" دادا نے لوگوں کی آنکھوں میں دبکے ہوئے سوالوں کو زبان سے ادا کر دیا۔

"ہوگی کوئی۔" مراد بولا "مگر دادا! سچ کہتا ہوں' ایران بھی دیکھا اور عراق بھی اور مصر بھی۔ کہیں کشمیری سیب کی سی رنگت تھی تو کہیں چنبیلی کی سی۔ لیکن یہ گندم کا سا' ندی کنارے کی ریت کا سا' سنہری سنہری رنگ' یہ ہمارے ہندوستان ہی میں ملتا ہے۔

"ہندوستان میں اور بھی تو بہت کچھ ہے۔" نمبردار کا بیٹا رحیم' جو لاہور کے ایک کالج میں پڑھتا تھا اور ایسٹر کی چھٹیاں گزارنے گاؤں میں آیا تھا' بھاری بھاری کتابوں کی اوٹ سے بولا۔ "یہاں بنگال کے گلے سڑے ڈھانچے بھی ہیں اور بہار کے یتیم بھی ہیں' اور سارے ہندوستان کی وہ بیوائیں بھی ہیں جن کی آبرو کے رکھوالوں پر مشرق و مغرب کے میدانوں میں گدھوں' مچھلیوں اور کیڑوں نے ضیافتیں اڑائیں اور جن کے لہو کی پھوار نے فاشزم کا فانوس بجھا دیا' اور جن کے خون کی حدت نے کئی کافوری شمعیں روشن کیں۔ اور پھر ہندوستان میں تمہارے امرتسر' راولپنڈی اور ملتان بھی تو ہیں' جہاں صرف اس لیے عورتوں کی آبروریزی کی جا رہی ہے کہ ان کے ماتھے پر نیلی سی بندیا ہے اور جہاں بچوں کو ـــــ"

"نہیں نہیں بھئی۔" دادا بولا "بچوں کو نہیں۔ بچوں کو ابھی تک کسی نے کچھ نہیں کہا۔"

"بچے نہ سہی۔" رحیم کی آواز کانپنے لگی۔ "مگر کیا بندیا والی عورتیں اور کڑے والے نوجوان اور جنیؤ والے بوڑھے انسان نہیں ہیں؟ کیا وہ کسی اور

سیارے سے ٹپک پڑے ہیں؟ کیا ان کی امیدیں اور امنگیں اور ولولے مر چکے ہیں؟ کیا ان کے سینوں میں دل اور دلوں میں ـــــ"

ایک نوجوان دہقان نے احتجاج کیا "بات گندمی رنگ کی ہو رہی تھی ملک جی۔"

"اور میں کہہ رہا تھا۔" رحیم بولا "کہ گندمی رنگ کے علاوہ اور بھی تو بہت کچھ ہے دنیا میں۔ افریقہ کا حبشی ہے' امریکہ کا انڈین ہے' ہندوستان کا اچھوت ہے۔"

"دیکھو بھئی رحیم" دادا نے لجاحت سے کہا "اصل میں بات ہو رہی تھی اُس چڑیل کی۔" اور دادا نے ڈھیریوں کی طرف دیکھا جہاں مغربی افق پر چھائی بدلیوں کی جھریوں میں سے ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعیں شفق میں نہا کر اتر آئی تھیں "بات سے بات یوں نکلتی ہے ملک میرے کہ چڑیل کا ذکر آیا۔ مراد نے کہا کہ وہ عورت ہے اور عورت بھی ایسی کہ دیکھو تو خدا یاد آ جائے۔ اور وہاں سے بات چلی اس کے رنگ کی' اور رنگ تمہیں بنگال اور بہار لے گیا ـــــ اچھا بتاؤ' دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟"

"چار" حیران رحیم بولا۔

"چار اور چار؟"

"آٹھ۔"

"بس ٹھیک ہے۔" بوڑھا بولا "یہ ہیں تم پڑھے لکھوں کی باتیں۔ ہم بیچارے گنوار' ہم یہ باتیں کیا جانیں۔ ہاں تو مراد! تم کہتے ہو چڑیل سانچے میں ڈھلی ہوئی عورت ہے۔ اچھا تو اب یہ بتاؤ کہ اس کے بعد تمہاری آنکھ کھل گئی تھی نا؟"

ایک قہقہہ پڑا اور مراد خفا ہو کر بولا "خواب کی بات نہیں دادا۔ یقین نہ آئے تو کل چلو میرے ساتھ۔ پھر سے جوان نہ ہو جاؤ تو مونچھیں کتر لینا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میری۔"

"مونچھیں تو خیر تم نے پہلے سے کتر رکھی ہیں۔" دادا نے کہا "مگر دیکھو ابھی کیوں نہ چلیں سب کے سب؟"

لیکن مراد نے کہا کہ عورت کا رات کا ٹھکانا اسے معلوم نہیں۔ اور پھر اس نے عجیب و غریب انکشاف کو تفصیل سے بیان کیا: "بات یوں ہوئی کہ گھاس ختم ہو گئی' اور اُدھر اُتری ڈھلان پر کسی بدذات نے رات کی رات وہ صاف کیا ہے کہ ایک تنکا بھی ملا ہو تو قسم ہے۔ تم جانتے ہو کہ نوکری سے واپس آکر میں نے وارث سے ایک بیگھہ زمین خریدی تھی انھی پچھی ڈھیریوں میں۔ سو میں نے کہا کہ چڑیل میری ہی تاک میں تو ہوگی نہیں۔ چپکے سے جاؤں گا اور کسی نشیب سے گھاس کاٹ کر بھاگ نکلوں گا۔ درانتی کے علاوہ کلہاڑی بھی ساتھ لیتا گیا ـــــ اب کرنا خدا کا کیا ہوا کہ میں پگڈنڈی چھوڑ کر دبے پاؤں لپکا جا رہا تھا کہ اچانک ایک جھاڑی کے پیچھے سے وہ یوں اٹھی جیسے حقے کا کش لگانے سے چلم پر شعلہ ابھرتا ہے۔ کلیجہ دھک سے رہ گیا ـــــ وہ بے تحاشا بھاگی اور جھاڑی سے پرے ڈھلان پر سے اتر گئی ـــــ وہ جہاں نورے کے ریوڑ پر بھیڑیے نے حملہ کیا تھا ـــــ بس وہیں ـــــ اچھا تو جب وہ بھاگی ہے تو میں نے اس کے پاؤں کی طرف دیکھا جو بالکل سیدھے تھے میری تمھاری طرح ـــــ اور چڑیلوں کے پاؤں الٹے ہوتے ہیں نا؟"

"ہاں بھئی چڑیلوں کے پاؤں تو الٹے ہوتے ہیں۔" مولوی جی دلچسپی لے رہے تھی۔

"اور پھر دادا! اس کے گھنے بال یوں اڑے جیسے کوئی شریر بچہ گھنگھور گھٹا کے ایک لمبوترے سے ٹکڑے میں دھاگا ڈال کر اسے اڑاتا پھرے۔"

"انسان بن انسان۔" دادا بگڑ گیا۔ "بھوت پریت کی باتیں نہ کر۔ بادل کا ٹکڑا اڑاتا پھرے۔ ابے سیدھی طرح یوں کیوں نہیں کہتا کہ ـــــ جیسے

دھوئیں کی لہر' یا سیاہ ریشم کا ڈھیر۔"

مولوی جی بول اٹھے "اور وہ ماتھے کی بندیا؟ ـــــ وہ بھول گئے؟"

"مگر مولوی جی" مراد نے فریاد کی۔ "مسلمان اور عیسائی اور پارسی سبھی عورتیں بندیا لگاتی ہیں شہروں میں۔ ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اور پھر بندیا یا کڑے یا جنیؤ یا مسواک سے بے چاری انسانیت پر تو کوئی آنچ نہیں آتی۔ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔"

دادا بولا "سچ مچ مولوی جی! وہ آپ کو وہاب مجذوب تو یاد ہوگا جس کے سر پر برہمنوں کی سی اتنی لمبی چٹیا تھی' اور ماتھے پر تلک لگاتا تھا' اور وہ قرآن مجید کا حافظ تھا' اور کنوئیں میں اتر کر خدا کو یاد کرتا تھا۔"

مولوی جی نے کہا "ہاں بھئی۔ وہاب مجذوب کسے یاد نہیں۔ وہ نہ ہوتا تو اس سال علاقہ قحط کی لپیٹ میں آ جاتا' مگر اس نے ایک بار عصا اٹھا کر اسے آسمان میں جیسے چبھو دیا' اور وہ بارش ہوئی کہ نالے ندیاں دریاؤں میں بدل گئے تھے۔"

"کون جانے یہ بھی کوئی مجذوب عورت ہو" دادا نے کہا۔ تب لوگوں کے چہروں پر سنجیدگی چھا گئی۔ اور مراد نے حالات کے اس نئے پلٹے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اٹھ کر جانا چاہا۔

"بھئی پورا قصہ تو سناؤ۔" لوگوں نے تقاضا کیا۔

اور وہ بولا "چلو نہیں سناتے۔ جھوٹ تھا سب کچھ۔ اس کے بعد آنکھ کھل گئی میری ـــــ بس؟ ـــــ اب تشفی ہو گئی ہو گی تم سب کی؟"

دادا نے بھی ہجوم کے بدلتے ہوئے تیور بھانپ لیے تھے' بولا "بھئی بات سے بات نکل آئی تھی ورنہ ـــــ"

ایک دم سب لوگ چلا اٹھے "اب اس قصے کو ختم بھی کرو چچا ـــــ ہاں تو مراد بھیا' پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا" مراد بناوٹی نارضامندی سے بولا "بس میں اس کے پیچھے پیچھے گیا اور ـــــ اور نشیب میں اترا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ چقماق کے ٹکڑوں کی اتنی بڑی ڈھیری سی لگائے بیٹھی ہے' ـــــ چپ چاپ۔ پلکیں تک نہیں جھپکیں اس کی ـــــ اور جب مجھے دیکھا تو اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی' اور چلانے لگی۔ "چلے جاؤ' چلے جاؤ' مجھے چھوؤ نہیں ـــــ مجھ سے دور رہو' چلے جاؤ" ـــــ اور وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر زیادہ شدت سے رونے لگی ـــــ میں نے اپنی پوٹلی کھول کر کہا "یہ کھانا رکھے جا رہا ہوں تمہارے لیے" ـــــ اور پھر میں چلا آیا۔

لوگ گلیوں میں بکھر گئے' اور دوسرے روز فجر کی نماز کے بعد مولوی جی نے نمازیوں کو روک کر کہا "یہ ضروری نہیں کہ ولی اور قطب' ابدال اور مجذوب صرف مردوں میں سے اٹھیں۔ عورتیں بھی تو انسان ہیں۔ اگرچہ مجذوب عورت کے ماتھے پر بندی کا نشان ہے مگر کون جانے کہ یہی نشان اس کی بزرگی پر دال ہو ـــــ اس مجذوب عورت کو ہمارے علاقے میں اتار کر اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا ہے۔ اس لیے بھائیو! اس کی قدر کرو' اس کی خدمت کرو' اور یقین کرو کہ ـــــ" اور ان کی آواز فرط گریہ سے بھرا کر گھٹ گئی اور وہ رسمی سی دعا مانگ کر چادر سے آنکھیں پونچھتے ہوئے منبر پر سے اتر آئے۔

اسی روز مولوی جی سے مشورہ کر کے ذیل دار نے چوپال پر پنچایت بلائی اور فیصلہ ہوا کہ باری باری ہر شخص اسے خوراک پہنچایا کرے۔ تین چار سو گھروں کا گاؤں ہے' مدتوں کے بعد دوسری باری آئے گی۔ "جب ایسے لوگ کہیں ظاہر ہوتے ہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ سنبھل جاؤ' خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔"

رحیم سنبھل کر بولا "مگر ابا جان! ایک عورت کے لیے اس قدر اہتمام

!ـــــ اور ہندوستان کے وہ کروڑوں باشندے جن کے پاس کھانے کو ایک ٹکڑا نہیں' تن ڈھانکنے کو ایک دھجی نہیں ـــــ ان کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"کیوں بے مراد!" مولوی جی نے رحیم کی بات کاٹ دی "کپڑے تو پہن رکھے ہیں نا اس نے؟"

"جی ہاں استاد جی۔" مراد بولا۔ "ہیں تو سہی مگر ذرا ـــــ میرا مطلب ہے ذرا واجبی سے ہیں۔"

"ان لوگوں کو لباس کی کیا پروا۔" مولوی جی نے تسبیح کی گردش تیز تر کر دی "جو ساری ننگ دھڑنگ انسانیت کو ڈھانپنے نکلے ہوں' جن کی لو صرف خدا سے لگی ہے اور جن کا بستر گھاس اور چھت آسمان ہے' اور تارے چراغ ہیں اور پھول ساتھی ہیں اور ـــــ"

"اور چقماق کے ٹکڑے ـــــ ڈھیروں کے ڈھیر" مراد بولا۔

ادھر سے رحیم جھپٹا "اور آندھیاں اور سیلاب اور بجلیاں' جھلساتی ہوئی دھوپ اور مہاوٹ کی راتیں۔"

مگر رحیم کی طرف کسی نے توجہ نہ کی۔ اور گاؤں والے مجذوب عورت کے پاس ہر روز صبح و شام کھانا پہنچانے کی سکیم پر یوں عمل کرنے لگے جیسے وہ کچھ عرصہ پہلے تھانیدار کے لیے انڈے اور جنگل کے داروغہ کے لیے گھی اور صاحب ضلع کے لیے شہد کے مرتبان مہیا کیا کرتے تھے۔

مسجدیں خلافِ معمول نمازیوں سے بھری رہنے لگیں۔ گاؤں پر ایک ہیبت افزا سناٹا چھایا رہنے لگا اور عورتیں راتوں کو سونے سے پہلے رو رو کر دعائیں مانگتیں: "ماں! تم جو ویران ڈھیریوں پر رہتی ہو' اگر گلابی چقماق جمع کرتی ہو اور سنسان گھاٹیوں میں گھومتی ہو' تم جس نے دنیا پر لات مار کر صرف اپنے پیدا کرنے والے کی ذات سے لو لگا رکھی ہے' تم ہمارے کھیتوں پر بارشیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

برساؤ اور ہماری اولاد پر رحمتیں چھڑکو۔"

چند ہی مہینوں میں مجذوب عورت نے دیہاتیوں کے ذہن میں وہ حیثیت اختیار کر لی جو گاؤں کی مسجد یا پنگھٹ یا مدرسے کی تھی۔ آہستہ آہستہ نواحی دیہات سے بھی لوگ آنے لگے اور مسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر اور ڈھیریوں کی طرف رخ کر کے منتیں ماننے لگے: "میرا لڑکا خیریت سے واپس آئے۔" "میری بیٹی کی بیماریاں دور ہو جائیں۔" "میرے بیلوں کے کھر ٹھیک ہو جائیں" ——اور پھر بڑے دنوں کی چھٹیوں میں جب رحیم گاؤں آیا تو بولا "یہ دعا کیوں نہیں مانگتے کہ ملک آزاد ہو جانے کے بعد ہم آزاد قوموں کی طرح زندہ رہنا سیکھیں اور جمے ہوئے لہو کی ان تہوں کو اپنے ذہنوں پر سے کھرچ دیں جنھوں نے ہماری انسانیت کو چھپا رکھا ہے۔ نہ جانے غیروں کی بندگی کا کلنک ہمارے ماتھوں پر سے کب مٹے گا! —— نہ جانے——" مگر دادا نے اسے ہمیشہ کی طرح ٹوک دیا "بھولے بچے! فرشتوں نے ہم لوگوں کو سجدہ کیا تھا۔ اب ان سجدوں کی سزا بھی کو تو بھگتنا ہے' بندگی ہماری قسمت میں ہے بچے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو دادا۔" رحیم کا سارا علم اس کے حلق میں آکر پھنس گیا۔ "تم کیا جانو کہ ہم نے آزادی کو اپنے ہی لہو میں بھگو کر پلید کر دیا ہے' اور یہ عمل اب تک جاری ہے۔ اب تک ہمارے گھروں اور سڑکوں اور کھیتوں پر لاشیں بکھری پڑی ہیں اور بچے کچلے پڑے ہیں اور عورتوں کے جسموں پر عصمت کی ایک دھجی تک باقی نہیں۔ تم کیا جانو دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔"

دادا ہار ماننے والا کب تھا "وہی کچھ ہو رہا ہے جو یہ مجذوب عورت ہمیں روز دکھاتی ہے۔ چقماق ٹکرا رہے ہیں۔ چنگاریاں جھڑ رہی ہیں اور اس وقت تک جھڑتی رہیں گی جب تک سب چقماق گھس نہیں جاتے۔"

"چقماق بھی گھس جاتے ہیں دادا؟" مراد نے بچوں کی سی معصومیت سے پوچھا۔

اب گھستے نہیں تو ٹوٹتے تو ضرور ہیں۔" دادا اپنے نظریے کے محور کے گرد برابر گھوم رہا تھا۔

اور اچانک مراد نے دور بھوری پہاڑیوں پر نظریں دوڑائیں اور وہ اپنے ذہن میں الٹی زقند بھر کے پھر سے ایک شریر بچہ بن گیا —— وہ ہم جولیوں کے ہمراہ چقماق تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ چوٹیوں سے اتر کر وہ ڈھلان پر گھوما اور وہاں سے وادیوں میں اتر آیا۔ برساتی نالوں کے گول گول پتھروں میں پھنسے ہوئے لہریئے چقماق چنتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ یہ پہاڑ اور وادیاں اپنے آتشیں خزانے لٹا چکی ہیں۔ ان گلابی قاشوں کے سوا جو اس کی اور اس کے ساتھیوں کی جھولیوں میں تھیں' گھاٹیوں پر دور دور تک بکھرے ہوئے پتھر گلابی اور اودے رنگ سے خالی ہیں۔ زمین کی کوکھ کا شعلہ بجھ چکا ہے اور یخ بستہ کہرا چار طرف سے سمٹا آ رہا ہے۔ اسے جکڑ رہا ہے' اسے بھینچ رہا ہے۔

"مراد!" دادا نے لمبے لمبے پٹوں سے ڈھکے ہوئے سر کو جھٹکا "میں سوچ رہا تھا کہ یہ مجذوب عورت سارا دن چقماق سے چقماق بجاتی رہتی ہے مگر ان گھاٹیوں پر اتنے چقماق کہاں سے آئے کہ گھسیں بھی' ٹوٹیں بھی اور ختم بھی نہ ہوں۔"

"سچ مچ" دادا بولا "چقماق تو ختم ہو جائیں گے۔"

ذیلدار نے آگے بڑھ کر کہا "بھئی سچ مچ اگر چقماق ختم ہو گئے تو؟"

اور ذیلدار کی باتیں کئی زبانوں کی مسافتیں طے کرتی مولوی جی کے کانوں میں جا گھسیں اور انہوں نے نماز کے بعد مقتدیوں سے مخاطب ہو کر کہا:

"یا ایہا المؤمنین! اللہ تعالیٰ جل شانہ نے ہر کسی کو الگ الگ کام سپرد کر رکھے ہیں۔ تم ہل چلاتے ہو اور اناج پیدا کرتے ہو۔ یہ فقیر پر تقصیر پروردگار بے ہمتا کے احکامات سناتا ہے اور تمہیں اپنی عاقبت سنوارنے کو کہتا ہے۔ اور وہ مجذوب عورت جس نے کسی خدائی اشارے سے ہماری پہاڑیوں کو نوازا'

دن بھر چقماق رگڑتی اور چنگاریاں برساتی ہے۔ دنیا داروں کے لیے اس کا یہ شغل بے معنی ہے، لیکن اصل میں ان مجذوبوں کی ہر حرکت میں کروڑوں آسمانی راز چھپے ہوتے ہیں۔ مجھ سے پوچھو کہ جب میں چلہ کاٹ رہا تھا تو میرے قریب ایک مجذوب آکر بیٹھ گئے۔ چالیس دن بیٹھے رہے۔ اور جانتے ہو کیا کرتے رہے؟۔ ٹین کے ایک ڈبے میں کنکر بجاتے رہے۔ دن رات وہ اس ڈبے کو بجاتے اور بچوں کی طرح روتے اور جس روز انہوں نے ڈبے کو زمین پر پٹخ دیا تو جانتے ہو کیا ہوا؟——سنہ چودہ کی لام شروع ہو گئی۔"

"سبحان اللہ، سبحان اللہ!" دیہاتیوں نے پہلو بدلے۔

اور اب میرے بزرگو! میرے عزیزو! میرے دوستو! یہ مجذوب عورت چقماق سے چقماق بجاتی ہے اور چنگاریاں برساتی ہے۔ نہ جانے کیا کچھ ہونے والا ہے۔ مگر قبل اس کے کہ کچھ ہو ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ خاتون ہم سے مایوس ہو کر کسی اور طرف نہ نکل جائے۔ تم جانتے ہو کہ ہماری پہاڑیوں پر اکا دکا ہی چقماق نظر آتے ہیں اور یہ ختم ہو جائیں گے اور اس طرح رحمت کی بارش ختم ہو جائے گی——اور میرے بھائیو! یہ عورت تو خدا کا خاص کرم ہے، ورنہ ہم گنہگار کس لائق ہیں——ہم بدبخت جو جانتے ہیں کہ مسجد کے تیل کا کنستر پرسوں سے ختم ہو چکا ہے، مگر——"

مولوی جی تیل کے کنستر کے بارے میں بہت سی باتیں کرتے رہے۔ مگر سب لوگوں کے دلوں میں چقماق جمع کرنے کی دھن سما چکی تھی۔ اور یہ بات گاؤں گاؤں گھوم گئی کہ مجذوب عورت کو چقماق کے ڈھیر چاہئیں، اور پھر چند ہی دنوں کے بعد علاقے بھر کے لوگ سروں پر چقماق بھری ٹوکریاں رکھے۔ گدھوں پر چقماق کے بورے لادے اس گاؤں میں آنکلے۔ اور جب مسجد کے صحن کے ایک کونے میں چقماق کی پہاڑی سی ابھری تو پنچایت نے مل کر فیصلہ کیا کہ کل ان پتھروں کو اونٹوں پر لاد کر چپکے سے گھاٹی میں پھینک آنا چاہئے۔

"تم لوگ" رحیم نے تیز تیز چلتے ہوئے دادا اور مراد کو گلی کے موڑ پر روک لیا "تم اجڈ لوگ——"

دادا نے بھڑک کر کہا "اور تمہارا ابّا نہا اُجڈ ہوا کہ گاؤں بھر کا سردار ہے——خفا نہ ہونا بھئی، غریبی اجڈ پنا نہیں، غریبوں کو اجڈ نہ کہا کرو سمجھے، اگر میں پڑھا لکھا ہوتا تو سچ کہتا ہوں صوبے کی لاٹ صاحبی تو کہیں نہیں گئی تھی۔"

"سنو تو دادا!" رحیم بولا "تمھیں تو ہمیشہ مذاق کی سوجھتی ہے۔ تم——تم سادہ مزاج لوگ ہو۔ تم اب تک خان بہادروں اور نواب زادوں کے لیے خون کے بنک ہو——تم اب تک——"

"بھئی کچھ کہنا ہے تو کہہ بھی چکو۔" دادا جھلا گیا۔ "کیسی کاٹی کتری باتیں کرنے لگے ہو انگریزی پڑھ کے۔"

"مراد۔" رحیم نے رخ بدلا۔ "میں تم سے بات کر رہا ہوں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم پر غیر ملکی حکومت اور حکومت کے کارندوں نے اتنے ظلم توڑے ہیں کہ تمھیں ذرا سی بھی پناہ مل جائے تو یہ سمجھتے ہو کہ عرش کے دریچے کھل گئے۔ تم ساری عمر رئیسوں اور سیٹھوں کی سجائی ہوئی نمائش گاہوں میں بکاؤ پڑے رہے ہو اور ہزار ہزار بار بکتے رہے ہو۔ اور جب تمھیں کہیں سے ایک تعویذ ملتا ہے تو یوں سمجھتے ہو جیسے قسمت کی نکیل تمہارے ہاتھ میں آگئی۔"

"بھئی رحیم۔" مرد بے قرار ہو گیا۔ "دادا اور میں ساربانوں کے ہاں جا رہے ہیں۔ ساتھ ہی چاولوں کا انتظام کرنا ہے تاکہ لوگ چقماق پہنچا کر آئیں تو گاؤں کی طرف سے ان کی دعوت ہو جائے۔ سمجھے؟ ہم ذرا جلدی میں ہیں۔ تم لاہور کب جا رہے ہو؟"

رحیم نے تیوری چڑھا کر کہا "یہ پاگل عورت تمہیں کہیں کا نہ رکھے گی——"

"پاگل عورت !"——— دادا اور مراد رحیم کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی پلٹ کر مسجد کی محراب کو چوم رہے تھے۔"

دوسرے روز صبح سویرے اونٹوں کی ایک قطار کو مسجد کی گلی میں لایا گیا۔ اونٹوں کے گھٹنوں پر بندھے ہوئے گھنگروؤں اور گلے میں لٹکتی ہوئی گھنٹیوں کی جھنجھناہٹوں سے سارا گاؤں چونک اٹھا۔ مولوی نے فوراً "گھنگھرو اور گھنٹیاں اتار دینے کا حکم دیا' کیونکہ ——— "میرے بھائیو! ایک تو گھنگھرو گھنٹی مکروہ ہیں' دوسرے ان کی آواز سے مجذوب عورت کو تکلیف ہوگی۔ تیسرے ہم نمائش کے لیے نہیں جا رہے۔ یہ چقماق تو معمولی چیز ہے' نہ جانے آگے چل کر ہمیں کیا کیا قربانیاں دینا پڑیں۔"

فوراً" گھنگھرو اور گھنٹیاں اتار لی گئیں اور یہ چپ چاپ قافلہ ڈھیریوں کی طرف چلا۔ دادا اور مراد قافلہ سالاروں کی حیثیت سے آگے آگے جا رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

"دادا! میں تو کہتا ہوں کہ اگر اس بزرگ عورت نے یہیں ٹھکانا کر لیا تو ہمارا گاؤں اچھا خاصا قصبہ بن جائے گا اور چہل پہل ہو جائے گی۔"

"ہولے ہولے۔" دادا نے سرگوشی کی۔ "کسی نے سن لیا تو بات چل نکلے گی' اور کوئی من چلا شیرینیاں جمع کرنے یہیں کہیں کسی ڈھیری پر اڈہ جما لے گا۔"

"ٹھیک ہے دادا" مراد بولا "کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ یہ عورت آئی کہاں سے؟"

"اللہ نے بھیجی۔"

"اللہ نے تو بھیجی' مگر کہاں سے بھیجی؟"

"کہیں سے بھی بھیجی ہو' ہمیں اس سے کیا۔ ہمیں آم کھانے سے غرض ہے یا پیڑ گننے سے؟" اور مراد نے چپ سادھ لی۔

جب قافلہ ڈھیریوں کے قدموں میں پہنچا تو سورج اپنا سارا سونا لٹا چکا تھا۔ زمین کو جاڑا جکڑنے لگا تھا اور جھاڑیوں کے پتے ٹھٹھر کر گول مول ہونے لگے تھے۔ ڈھیریاں جیسے اونگھ رہی تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دھرتی کی ان سنگین چھاتیوں سے ساری زندگی نچڑ چکی ہے۔

"اف' کیسا ہول سا آنے لگا۔" دادا بولا۔ "تم یہاں کیسے آتے رہے ہو مراد؟"

اور مراد نے پلٹ کر غرور سے ساربانوں کی طرف دیکھا جن کے منہ کھلے تھے اور جن کے کانوں کی مندریں جیسے ذکر باری میں جھوم رہی تھیں' اور ان کے قدم یوں ادب سے اٹھتے تھے جیسے کانچ کے فرش پر چل رہے ہیں۔

مراد نے کئی عجیب ہرتے پھرتے راستوں سے قافلے کی رہنمائی کی۔ اور پھر ایک برساتی نالے کے عین وسط میں چقماق کا ایک سربلند شعلہ بھڑکا۔ سب کے سب چپکے سے پلٹے۔ دور سے دادا نے آواز دی "چلو بھئی مراد۔"

اور مراد پکارا "آیا دادا آیا" ——— اور وہ چٹانوں کے بے ہنگم موڑوں پر اگی ہوئی جھاڑیوں پر سبز رنگ کے ٹڈوں کو چونکاتا خاتون کی تلاش کرنے لگا۔ گہرے کھڈوں میں جھانکتا' برساتی نالوں کے خموں میں بھٹکتا پھرا۔ اور جب ہر طرف جگنو چمکنے لگے اور کہیں دور سے ایک ٹیٹری اندھیرے میں بلبلائی تو وہ چقماق کے ڈھیر کے پاس آ کر پوری طاقت سے پکارا "خاتون" ——— اس کی آواز چار طرف تالیاں پیٹتی' اندھیرے میں گرجتی' پہاڑیوں سے ٹکراتی شیشوں میں گر گئی۔ اور جواب میں اسے بہت سے گیدڑوں کی آوازیں سنائی دیں۔ جو شاید اس کی آواز سے چونک اٹھے تھے۔ ——— "خاتون !" وہ پکارا۔ اور پہاڑیوں نے اس کی آواز کو ہوا میں اچھال دیا۔ دیر تک فضا جھنجھناتی رہی۔ گیدڑوں کی چیخیں تیز تر ہو گئیں اور آس پاس کے ٹڈے خاموش ہو گئے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حیران اور مایوس ہو کر وہ گاؤں کو پلٹا۔ اس وقت چوپال پر ایک ہجوم اکٹھا تھا۔ الاؤ کا ایک شعلہ ناچ رہا تھا اور دہقانوں کے سنجیدہ چہروں پر ہراس اور احترام کے ملے جلے جذبات نے آسیب بکھیر رکھا تھا۔ مراد نے چوپال پر قدم رکھا تو ہجوم چونکا۔ الاؤ کا شعلہ کمان کی طرح لچک گیا اور دادا پکارا "کیسے عجیب لڑکے ہو تم۔ ہم تو سوچ رہے تھے کہ تمھاری تلاش میں چند جوانوں کو بھیجیں مگر کالی ڈھیری سب کے دماغوں پر سوار ہے۔ رحیم میاں کی ہمت بھی جواب دے گئی ہے۔ تم کہاں تھے اب تک؟"

"وہ چلی گئی ہے کہیں۔" مراد نے یہ الفاظ پھینک سے دیے، جیسے وہ دیر سے اس کے لبوں سے لٹک رہے تھے۔

"کون؟" دادا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"خاتون!"

"چلی گئی؟" سب پکار اٹھے "کہاں؟"

"نہ جانے کہاں۔"

"تم نے اسے پکارا؟"

"کئی بار۔"

"کہاں کہاں ڈھونڈا؟"

"کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا۔"

"چلی گئی؟"——دادا بے جان سا ہو کر دیوار سے لگ گیا۔

چوپال کے دروازے پر کھڑا ہوا ایک لڑکا تیر کی طرح گلی میں لپکا اور مسجد کے صحن میں جا کر پکار اٹھا۔ "مجذوب عورت چلی گئی۔"

"چلی گئی!" نمازی پکار اٹھے۔

اور پھر آن کی آن میں سارا گاؤں جمع ہو گیا۔ مسجد کے چراغوں سے فق چہروں پر جناتی زردی چھٹی ہوئی تھی۔ دیر تک چہ میگوئیاں ہوتی رہیں اور

آخر متفقہ فیصلہ ہوا کہ کل فجر کی نماز کے بعد سب گاؤں والے ڈھیریوں پر جائیں۔ ایک ایک چٹان ایک ایک جھاڑی کو چھان ماریں، اور اگر خاتون نہ ملے تو دور تک اس کا کھوج لگائیں، اس کا پیچھا کریں، اسے واپس لے آئیں۔ ورنہ یقین کرلو، کوئی ایسا عذاب ٹوٹے گا کہ صدیوں تک اس گاؤں کے کھنڈروں میں کوئی قدم نہ رکھے گا۔"

اس رات ہر گھر میں دیے جلتے رہے، عورتیں تسبیحوں پر درود شریف کا ورد کرتی رہیں، اور مرد دیر تک مسجد میں بیٹھے ذکر الٰہی میں مصروف رہے۔ چوپال کے حقے ٹھنڈے پڑ گئے اور دہقان گٹھڑیوں کی طرح کھٹولوں اور پیال پر سمٹے سکڑے بیٹھے رہے اور جب صبح ہوئی تو مولوی جی مسجد سے باہر آئے۔ گاؤں بھر نے نہایت عاجزی سے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور دادا اور مراد کی قیادت میں ایک انبوہ ڈھیریوں کی طرف بڑھا۔ عورتیں چھتوں پر چڑھ آئی تھیں۔ ننھے بچے گلیوں میں حواس باختہ سے کھڑے تھے۔ مولوی جی جگہ جگہ پلٹ کر کہتے گئے: "اللہ کو یاد کرو اور دعائیں مانگو کہ مجذوب عورت ہمیں مل جائے۔ وہ نہ ملی تو ایک ایسا زلزلہ آئے گا کہ سمندر خشکیوں پر چڑھ دوڑیں گے اور یہ ڈھیریاں جزیرے بن جائیں گی۔ اس لیے اللہ کو یاد کرو۔ اللہ کی راہ میں قربانیاں دو اور اللہ کے گھر کو شام کے بعد اندھیرا نہ رہنے دو۔ پرسوں سے

ڈھیریوں کے قدموں پر پہنچ کر ہجوم دادا اور مراد کے مشورے کے مطابق ٹولیوں میں بٹ گیا۔ بکھرتے ہوئے لوگوں کو دونوں دیر تک ہدایات دیتے رہے اور پھر اس گھاٹی کی طرف چل کھڑے ہوئے جہاں ایک دن پہلے انھوں نے چقماق کا ایک مینار سا ابھارا تھا۔ یہ مینار اسی حالت میں تھا اور گلابی سنگریزوں پر انتظار کی سی کیفیت تھی۔

"وہ جا چکی ہے دادا۔" مراد نے چقماق کے ڈھیر کے پاس رک کر

کہا۔ "وہ جا چکی ہے۔ اب وہ یہاں نہیں آئے گی۔"

"مگر تم نے کالی ڈھیری کو بھی دیکھا؟" دادا نے گھناؤنی سی اونچی پہاڑی کی طرف ہاتھ اٹھایا۔

"دیکھا نہیں مگر پکارا ضرور" مراد بولا "اور دادا میری پکار خالی خولی نہیں تھی ـــــ اس میں میری روح رچی ہوئی تھی۔"

دادا چونکا۔ "روح رچی ہوئی تھی" وہ مراد کو گھورنے لگا۔

"ہاں دادا۔" مراد نے ایک چقماق اٹھا کر مٹھی میں بند کر لیا۔ "اب کہ وہ چلی گئی ہے، تمہیں بتا ہی دوں کہ میں نے اسے ـــــ میں نے اسے ـــــ" مراد کی آواز بھرا گئی۔ پلٹ کر وہ کہیں دور دیکھنے لگا اور پھر چقماق کو ڈھیر پر گرا کر بولا۔ "دادا تم حیران ہو گئے؟"

دادا کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بولا "میرے خیال میں اب لوٹ چلیں تو بہتر ہے۔ وہ جا چکی ہے، اسے چلے جانا چاہئے تھا۔"

مراد نے حیرت سے دادا کی طرف دیکھا۔ "کیا محبت کرنا گناہ ہے دادا؟"

دادا نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبا کر کچھ سوچتا رہا۔

"دادا!" مراد پکارا، اور بوڑھے کو خاموش پا کر آگے بڑھ گیا۔

"مراد!" بہت دیر کے بعد دادا نے اسے آواز دی۔ مگر مراد کالی ڈھیری کا کافی حصہ طے کر چکا تھا۔

"مراد۔" دادا وحشت زدہ سا ہو کر مراد کی طرف بھاگا۔ "دیکھو مراد سکندر کے زمانے سے لے کر اب تک اس ڈھیری پر کوئی نہیں گیا۔ چڑیل کی روح تمہاری کھوپڑی کا گودا تک نوچ لے گی۔ وہ وہاں موجود ہے۔ وہ سینکڑوں صدیوں سے وہاں موجود ہے، ـــــ مراد ـــــ مراد!"

مگر مراد مشاق کوہ نوردوں کی طرف لپکا چلا گیا اور دادا اسے پکارتا رہا،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور پہاڑیاں گونجتی رہیں۔ آس پاس بکھرے ہوئے لوگ دادا کی طرف بھاگے اور جب ایک ہجوم کالی ڈھیری کے قدموں میں جمع ہو گیا تو دادا بولا "اب وہ نہیں آئے گا۔ مجذوب عورت نے ہم سے یہ پہلی قربانی لی ہے ـــــ مگر دوستو! کتنی بڑی قربانی!" وہ اچانک بچوں کی طرح رونے لگا۔ اور جلی بجھی چٹانوں کا رخ کر کے بلبلایا "مراد ـــــ ہو مراد!"

"اب وہ نہیں آئے گا۔" مولوی جی بولے "ابھی اس کی کھوپڑی چٹخنے کی آواز آئے گی اور ـــــ"

"مولوی!" دادا یوں گرجا جیسے اس نے مولوی جی کو کوئی زبردست گالی دی ہے۔ ہجوم دم بخود رہ گیا۔ اب دادا پھر سے رونے لگا "وہ آئے گا ـــــ مراد آئے گا" ـــــ آنکھیں پونچھ کر اس نے کالی بجھنگ چٹانوں کی طرف دیکھا اور پھر سر جھٹک کر بولا "نہیں۔ وہ اب نہیں آئے گا۔"

کافی دیر تک لوگ دادا کو سمجھاتے رہے کیونکہ اس پر دیوانگی سی طاری تھی۔ اس کی آنکھیں اجڑ سی گئی تھیں اور اس کے ہونٹ کچھ اس انداز سے کھلے تھے، جیسے وہ برسوں کا پیاسا ہے۔ مولوی جی نے تسبیح کو بے تحاشہ گھماتے ہوئے دادا کے جسم پر کئی بار اپنا پاک تنفس برسایا اور بکھرے ہوئے لوگ جمع ہوتے رہے اور مشورے ہوتے رہے کہ مراد کو کالی ڈھیری سے کیسے اتارا جائے۔

"کیسے اتارا جائے!" رحیم ہجوم سے پکارا "دادا کو اگر مراد سے اتنی ہی محبت ہے تو ہمت کرے۔ ہم تو بھئی کوئی اچھی سی موت مریں گے۔ قوم کی خاطر اپنی جان دیں گے۔ سکندر کے زمانے کی چڑیل کے ہاتھوں میں اپنی کھوپڑی کو گیند کیوں بننے دیں؟"

"تم میں سے خدا کی ذات پر کس کس کو یقین ہے؟" دادا کسی ایسے جذبے سے پکارا کہ اس کی گردن کی رگیں پھول گئیں اور ڈاڑھی کے بال اکڑ

گئے۔

"ہم سب کو اللہ تعالیٰ جل شانہ کی ذات پر یقین ہے" مولوی جی نے تسبیح کو مٹھی میں سمیٹ کر سارے گاؤں کی نمائندگی کی۔

"خدا کی ذات بڑی کہ چڑیل کی؟" دادا جیسے ہجوم کا امتحان لے رہا تھا۔

مولوی جی غصے اور طنز سے ہنسے "یہ کفر کا کلمہ ہے دادا! سنبھل کر بولو۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ خداوند تعالیٰ سب سے بڑے ہیں۔"

"تو پھر چلو۔" اس نے سپہ سالاروں کی طرح باہیں ہوا میں لہرائیں اور وہ کالی ڈھیری پر چڑھتے ہوئے بولا' "خدا کی ذات پر بھروسہ ہے تو چلو میری ساتھ۔"

"ارے!" مولوی جی نے تسبیح رولنا شروع کر دی۔

"دماغ چل گیا ہے۔" رحیم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

گاؤں والے ایک لحہ کے لیے خاموش رہے اور پھر یکبارگی پکار اٹھے۔

"دادا!"

مگر دادا آگے بڑھتا چلا گیا۔

"دادا!" گاؤں والوں کی پکار بلند تر ہو گئی۔

اور دادا چٹانوں کے کناروں کو جکڑتا' سوکھی سڑی جھاڑیوں کو تھامتا لپکتا چلا گیا۔

اور پھر اچانک ہجوم کے قدموں تلے کنکر چیخ اٹھے۔ لوگ ڈھیری کی طرف لپکے۔ "دادا!" وہ چلّائے "ہم بھی آ رہے ہیں دادا۔"

دادا نے پلٹ کر دیکھا۔ ہجوم اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ البتہ مولوی جی سر جھکائے تنہا کھڑے تھے اور ہجوم کو کھلی آنکھوں سے گھور رہے تھے اور تسبیح رواں دواں تھی'——اور رحیم' مولوی جی اور ہجوم کے درمیان ڈھیری

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پر چڑھنے کی یوں کوشش کر رہا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار اس کے قدموں نے کنکروں کو مَس کیا ہے۔

ہجوم دادا کے پاس پہنچا ہی تھا کہ چوٹی پر سے آواز آئی۔ "دادا!"

یہ آواز فضا میں چکراتی ہوئی ہر طرف گونج گئی اور مولوی صاحب ایک بچے کی طرح ہمک کر ایک چٹان پر چڑھ گئے اور رحیم نے طے کی ہوئی مسافت الٹے قدموں سے پھر سے طے کر لی۔

"دادا!" جیسے کالی ڈھیری کی چوٹی پکاری۔

اور دادا نے نہایت مشکل سے جواب دیا "مراد بیٹا!"

"وہ نہیں گئی——وہ یہیں ہے" آواز آئی۔

اور ہجوم یہ سن کر اِس تیزی سے چوٹی کی طرف بھاگا کہ لڑھکتے ہوئے پتھروں سے بچنے کے لیے مولوی جی برساتی نالے کے کنارے تک ہٹ گئے' اور رحیم اِس تیزی سے چوٹی کی طرف بڑھا جیسے چٹانوں اور جھاڑیوں پر سے تیرتا ہوا جا رہا ہے۔

آن کی آن میں ہجوم چوٹی پر جا پہنچا اور پھر یوں تھم گیا جیسے اس کے سامنے یکایک ایک دیوار ابھر آئی ہے۔ سب کی آنکھیں پتھرا گئیں اور چہرے فق ہو گئے۔

سامنے مراد ایک روتے ہوئے نوزائیدہ بچے کو بازوؤں پر اٹھائے کھڑا تھا اور وہ کہہ رہا تھا: "تم حیران ہو رہے ہو دادا؟ پر اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے۔ یہ تو ایک نیا انسان ہے۔ پچھلے چیت کی حیوانیت نے اسے جنم دیا ہے۔ یہ منوں بہے ہوئے لہو کا جوہر ہے۔ تم ایک دوسرے کو مبارک باد کیوں نہیں کہتے۔ دیوانی انسانیت کی کوکھ سے نکلے ہوئے اس نئے انسان کو تم ہاتھوں ہاتھ کیوں نہیں لیتے' اور تم یہاں میرے پاس آ کر اور اس چوٹی پر کھڑے ہو کر ساری دنیا کو یہ کیوں نہیں بتاتے کہ دھرتی کی اجڑی ہوئی مانگ کا سیندور پھر سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چمک اٹھا ہے ـــــ وادا ـــــ وادا۔"

"مگر اس عورت کے ماتھے پر تو بندیا کا نشان تھا۔" نیچے سے مولوی جی نے ایک اعتراض اچھالا۔

اور مراد پکارا "مگر بچے کا ماتھا تو چاند کا ٹکڑا ہے۔"

"چڑیلوں کے بچے ایسے ہی ہوتے ہیں!" مولوی جی نے جیسے ساری دنیا کو سرزنش کی۔

ہجوم ایک دم دادا کی قیادت میں رحیم سمیت نیچے کی طرف پلٹا اور مراد انسانیت کی نئی نویلی امانت کو اپنے ہاتھوں پر بلند کر کے پکارا "کیا تم میں ایک انسان بھی ایسا نہیں جو اس نئے انسان کو اپنی دھرتی کی جنت میں بسا لے؟ ـــــ اگر نہیں تو یاد رکھو کہ جنت سے نکالا ہوا انسان اپنی ایک نئی دھرتی اور ایک نئی جنت بسانے پر بھی قادر ہے ـــــ اور یہ جنت تمہاری جنت کے کھنڈروں پر ابھرے گی۔ سنتے ہو؟ ـــــ ارے سنتے ہو؟"

جواب میں چٹانیں تالیاں پیٹتی رہ گئیں۔